آوازِ لق لق

از

حاجی لق لق

آوازِ لق لق

از

حاجی لق لق

بار چہارم

قیمت 3/50

کتابستان - ۶۰ سروجنی مارکیٹ - نئی دہلی،
(مکتبہ نقد پریس دہلی)

سول ایجنٹ

حالی پبلشنگ ہاؤس - دہلی ۶

انتساب

میرے اس تصنیف کو جس کا ہر ورق اپنے دامن میں قہقہوں کا ہجوم لئے ہوئے ہے۔ اپنے محترم و مکرم اور ملک کے رئیس میجر نواب ممتاز محمد خان آف سرگودھا کی بابرکت شخصیت سے منسوب کرتا ہوں میرا خیال ہے کہ اس پیشکش سے حق بحقدار رسید کا مطالبہ خوش اسلوبی سے پورا ہو گیا ہے۔

"لوٹ لوٹ"

افسانے

دیباچہ

آوازِ لق لق ملک کے مایۂ ناز فطرت نگار حاجی لق لق صاحب کا تازہ شاہکار ہے۔ حاجی صاحب کے قلم معجز رقم سے دنیائے ادب کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اور اُن کی تعریف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ حاجی صاحب کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ وہ ظرافت کے پردے میں اخلاق آموز سبق دے جاتے ہیں۔ اور اندازِ بیان اتنا دلچسپ اور دلپذیر ہوتا ہے کہ بار بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ ظرافت نگاری کا ایک نیا طرز آپ نے ایجاد کیا ہے۔ جس کو پڑھ اور سن کر ہر شخص داد دینے پر مجبور ہوتا ہے۔

آپ کے مزاحیہ افسانوں کا پہلا مجموعہ ہم نے "پرواز" لق لق کے

نام سے شائع کیا تھا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہر سال نیا اڈیشن شائع کرنا پڑتا ہے۔ ہم پبلک کے ممنون ہیں کہ اس نے پرداز لق لق کی خریداری سے ہماری حوصلہ افزائی کرکے ہمیں اسے قابل بنایا کہ ہم حاجی صاحب کی دوسری تصنیف پیش کرسکیں۔

پبلشر

ریل بابو کانفرنس

شاید بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ لاہور میں اُن ریل بابوؤں کی ایک ایسوسی ایشن قائم ہے جو پنشن پا چکے ہیں۔ یہ بڈھے بابو ہر مہینے کے پہلے اتوار ایک کانفرنس منعقد کرتے ہیں۔ جو ریلوے روڈ پر میسرز ریلو رام اینڈ سنز کے دفتر میں ہوا کرتی ہے۔ لالہ ریلو رام بھی سابق ریلوے بابو ہیں۔ آپ اسٹیشن ماسٹر ہوا کرتے تھے۔ آپ پنشنر ہیں۔

کل مجھے اس کانفرنس کا علم ہوا تو ایک پنشنر ریل بابو کی وساطت سے جو ہمارے محلے میں رہتے ہیں میں بھی اس میں شامل ہوا۔ اور یہاں کے حالات دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایسوسی ایشن کا چندہ ایک روپیہ ماہوار ہے۔ اور وصولی کی یہ صورت ہے کہ ایک بابو اس کھڑکی کے اندر کی طرف بیٹھا ہوتا ہے جو دفتر کے برآمدے میں کھلتی ہے۔ اس کے سامنے چھوٹی سی میز پر ٹکٹ رکھے رہتے ہیں اور ساتھ ہی اس تاریخ کی مہر۔ ممبر آتے ہیں تو کھڑکی کے پاس جاکر ایک روپیہ ادا کرتے ہیں۔ ٹکٹ بابو ٹکٹ پر کھٹ سے مہر لگاتا ہے اور ٹکٹ ممبر کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔

دفتر کے دروازہ میں ایک گیٹ کیپر ہاتھ میں سرقتا لئے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ٹکٹ کا ایک کونہ کاٹ کر ممبر کو اندر جانے کی اجازت دیتا ہے۔ اندر کرسیاں لگی ہوتی ہیں جن میں ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کی کرسیوں پر " ریزرو " کا ٹکٹ لگا ہوتا ہے۔

مجھے ٹکٹ نہ خریدنا پڑا کیونکہ مہمانوں کے لئے داخلہ مفت ہے میں نے اندر جاکر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ ایک طرف ایک بورڈ پر لکھا ہے کہ " تھوکو مت "۔ اور دوسری طرف ایک دوسرا بورڈ آویزاں ہے جس پر یہ سطور لکھی ہیں۔

" اگر کوئی شخص بغیر رضامندی اپنے ہمراہیوں کے تمباکو نوشی کرے گا تو اس کو پچاس روپیہ تک سزائے جرمانہ دے سکتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص باوجود اس امر کے کہ اس کو کسی عہدہ دار نے تمباکو نوشی سے منع کیا ہو تمباکو نوشی پر اصرار کرے گا تو کوئی عہدہ دار اسے ہال سے باہر نکال سکتا ہے "

ایک دیوار کے ساتھ ساتھ ایک زنجیر جاتی تھی جس کے وسط میں ایک چھوٹے سے بورڈ پر لکھا تھا " خطرہ کے وقت زنجیر کھینچو "۔ ایک کیل سے پیتل کی گھنٹی لٹک رہی تھی۔ جیسی کہ گائے بھینسوں کے گلے میں باندھا کرتے ہیں۔

صدر کی میز کے سامنے میں نے ایک عجیب بات دیکھی۔ جس طرح تقریر کرنے والے کے منہ کے سامنے لاوڈ سپیکر کا مائیکروفون ہوتا ہے اس طرح یہاں ایک چھوٹا سا سگنل نصب تھا جو بالکل ریلوے سگنل کی نقل تھا۔

یہ ایک تار کے ذریعہ اُوپر نیچے ہوتا تھا۔ اور اُس تار کا دوسرا سرا پریذیڈنٹ کی میز پر ایک بھاری پیپر ویٹ کے نیچے دبا ہوا تھا۔

اس دفعہ کانفرنس کی صدارت کے فرائض میرے ہم محلہ چودھری غلام احمد نے انجام دینے تھے وہ کرسی صدارت پر بیٹھ گئے۔ جب سارے ممبر اندر آ چکے تو گیٹ کیپر نے دروازہ بند کر دیا۔ پریذیڈنٹ نے میز سے ایک لائن کلیر اٹھا کر سیکرٹری کو دیا جو میز کے دائیں طرف کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس مقصد کے لئے ردّی فروشوں سے ریلوے کے استعمال شدہ لائن کلیر لائے جاتے ہیں۔ سیکرٹری لائن کلیر لے کر اُٹھا اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ممبروں میں سے ایک کے ہاتھ میں دے آیا۔ یہ وہ ممبر تھا جس نے سب سے پہلے تقریر کرنی تھی۔ سیکرٹری نے واپس میز کے پاس آ کر اپنی جیب سے ایک سیٹی نکالی، اور بجائی ایک شخص نے کونے میں لٹکی ہوئی گھنٹی کو بجایا تقریر کرنے والا۔ اُٹھ کر میز کے پاس اور سگنل کے عین سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پریذیڈنٹ نے پیپر ویٹ ہٹا کر تار کو ڈھیلا کر دیا۔ جس سے سگنل ڈاؤن ہو گیا اور مقرر نے اپنی تقریر کی ڈاک گاڑی چھوڑ دی۔

میں یہاں بتا دوں کہ ریل بابو کانفرنس میں صرف ممبروں کے خاص دوستوں کو ہی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ممبر اپنی تقریروں میں اپنی عہد ملازمت کی آپ بیتیاں سناتے ہیں جن میں بعض جرائم قسم کی ہوتی ہیں اور اُن کا عوام تک یا یوں کہیئے کہ افسروں تک پہنچ جانا خطرناک ہے۔

تقریر کرنے والے صاحب کا نام میلا رام تھا۔ اور آپ نے یوں تقریر

شروع کی۔

صاحبان! جن دنوں میں لاہور وزیرآباد لائن پر ٹی ٹی کے طور پر چلتا تھا ایک روز عجیب واقعہ ہو گیا۔

میں وزیرآباد سے لاہور کی طرف آرہا تھا کہ ایک ڈبے میں میں نے ایک شخص کو پکڑا جس کے پاس ڈیڑھ من کے قریب خربوزے تھے اور ان خربوزوں کا کرایہ نہیں ادا کیا گیا تھا۔ میں نے اس کا ٹکٹ دیکھا جو اس کے ساتھی کے پاس تھا اور خربوزوں کی بابت دریافت کیا تو اس نے کہا کہ جلدی کے باعث میں نے انہیں بک نہیں کرایا۔ میں نے اپنی جیب سے تولنے کا کانٹا نکال کر خربوزوں کا وزن کیا اور دوسری جیب میں میمو بک نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا لیکن جیب خالی تھی۔

بات یہ ہوئی کہ پچھلے ڈبے میں میں نے ایک بے ٹکٹ مسافر کو چارج کیا تھا اور میمو بک وہیں دھری رہ گئی ان دنوں مجھے حکم مل چکا تھا کہ چلتی گاڑی میں ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں مت جاؤ۔ اس لئے میں نے گاڑی ٹھہرنے تک انتظار کیا۔ اگلے سٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو میں پچھلے ڈبے میں گیا لیکن میمو بک غائب تھی۔ میں نے مسافروں سے پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ ہمیں علم نہیں اور یہ کہ آپ یہاں سے لے گئے تھے بات دراصل یہ تھی کہ وہ مجھ سے مذاق کر رہے تھے یہاں گاڑی کا سٹاپیج صرف ایک منٹ تھا۔ وہ ہماری تکرار میں گزر گیا اور گاڑی چل پڑی آخر ایک مسافر نے ہنستے ہوئے میمو بک میرے ہاتھ میں دے دی لیکن اب اگلے ڈبے میں جانے کے لئے مجھے

پھر انتظار کرنا پڑا۔

اگلے سٹیشن پر گاڑی رُکی تو میں خربوزوں والے ڈبے میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں صرف دو خربوزے سیٹ پر پڑے ہیں۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو خربوزوں والی گٹھڑی کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے اس بھلے مانس سے پوچھا کہ خربوزے کہاں ہیں؟ اس نے کہا کہ مسافروں سے پوچھئے میں نے سب مسافروں سے مخاطب ہو کر دریافت کیا کہ خربوزے کہاں ہیں؟ سب نے یک زبان ہو کر اور اپنے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا "خربوزے یہاں ہیں"

میں بڑا خفیف ہوا اور خربوزوں کے مالک کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے دونوں خربوزے اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیئے اور کہا یہ آپ کا حصہ ہے۔ مجھے اس کی حرکت پر بے اختیار ہنسی آگئی اور میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے یہ کہہ کر اس سے مصافحہ کیا کہ آپ بڑے خوش طبع آدمی ہیں اور آج سے میں آپ کو اپنا دوست سمجھوں گا۔ اس نے جواب دیا کہ اگر آپ دوست ہیں تو ذرا بیٹھ جائیے۔ میں آپ کو ایک اور بات بتاتا ہوں۔

میں بیٹھ گیا اور اس نے کہا "جناب من" میں نے نہ صرف خربوزے ہی بک نہیں کرائے تھے۔ بلکہ خود بھی بے ٹکٹ ہوں میں نے حیران ہو کر کہا "بے ٹکٹ؟ آپ کا ٹکٹ تو ان صاحب نے مجھے دکھایا تھا" ؛ وہ بولا "بیشک۔ لیکن وہ ان کی بیوی کا ٹکٹ ہے جو زنانہ ڈبہ میں بیٹھی ہے۔"

اس کے بعد اس شریف آدمی نے کہا کہ میں کسی وجہ سے ٹکٹ نہیں خرید سکا تھا اس لئے پلیٹ فارم پر مجھے ایسے شخص کی تلاش ہوئی جس کے ساتھ زنانہ سواری بھی ہو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ زنانہ سواریاں تو زنانہ ڈبہ میں بیٹھ جاتی ہیں لیکن ان کے ٹکٹ ان کے مردوں کے پاس ہوتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ ان صاحب کے ساتھ ایک خاتون ہے یہ اس کو زنانہ ڈبہ میں بٹھا کر خود اس ڈبے میں آ بیٹھے اور میں بھی ان کے پاس آ بیٹھا۔ بیٹھتے ہی میں نے ایک بہت خوبصورت خربوزہ گٹھڑی سے نکال کر ان کی خدمت میں پیش کیا تاکہ راہ و رسم پیدا ہو جائے اور جب باتوں باتوں میں ذرا سی بے تکلفی ہو گئی تو میں نے اپنی مشکل بتائی انہوں نے مہربانی کر کے مجھے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں۔

مسافر کی یہ بات سن کر مجھے فوراً اپنے سرکاری فرض کا احساس ہوا میں نے اپنی ساری سروس میں کبھی کسی بے ٹکٹ پر رحم نہیں کھایا تھا ہمیشہ کرایہ چارج کیا لیکن اس نئی دوستی کے بعد میں سوچنے لگا کہ اس نئے دوست کو کس طرح معاف کر کے محکمہ کے حق میں دیانتی کروں؟ آخر میں نے ایک میمو کاٹ کر اسے دے دیا اور کہا کہ اسے اپنے پاس رکھئے وہ حیرت سے میری طرف تکنے لگا۔ میں نے کہا کرایہ کی فکر نہ کرو میں اپنی جیب سے ادا کر دوں گا۔

یہ شخص آج تک میرا دوست ہے۔ اس کا نام شیخ ظہور حسن

ہے اور وہ آج کل اخبار "شہباز" کا ہیڈ کاتب ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک روز بابو میلا رام کی تقریر یہاں تک پہنچی تھی کہ صاحب صدر نے سگنل کے تار کو کھینچا جس سے سگنل اَپ ہوگیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بابو میلا رام کا وقت ختم ہوگیا ہے۔ بابو میلا رام اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

اتنے میں پھر گھنٹی بجی اور ساتھ ہی ہال کا بغلی دروازہ کھلا۔ اس دروازہ سے ایک شخص نکلا جس نے صدا دی "ہندو مسلمان چائے بسکٹ"۔ یہ آواز سن کر سب لوگ کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ساتھ والے کمرے میں گئے۔ جہاں ٹی پارٹی کا انتظام تھا۔ میزوں پر چائے، کیک، بسکٹ اور پھل قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ یہاں سب نے کھایا پیا اور پھر ہال میں آ کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔

اب پھر لائن کلیر دیا گیا۔ سیٹی اور گھنٹی بجی اور ایک اور صاحب تقریر کے لئے میز کے پاس گئے جن کا نام خورشید علی تھا۔ سگنل ڈاون ہوا اور آپ نے یوں تقریر شروع کی۔

صاحبان! جن دنوں میں لاہور اسٹیشن پر پارسل کلرک تھا ان ایام کا ایک واقعہ سنئے:۔

ہم چار پارسل کلرک تھے۔ دو ہندو ایک سکھ اور ایک میں یعنی مسلمان ہمارا معمول تھا کہ ہم کھانے پینے کی چیزوں کے پارسل کھول لیا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ حصہ نکال کر کھا لیتے اور پیکنگ کی اشیاء ڈال کر

وزن پورا کر دیا کرتے تھے۔

ایک روز دس سیر وزن کا ایک پارسل آیا۔ جس کے اوپر لکھا تھا "مٹھائی" یہ لفظ پڑھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا اور ہم نے پارسل کو کھول مارا۔ دیکھا کہ اس میں لڈو، پیڑے اور ہر قسم کی مٹھائیاں بھری ہوئی ہیں۔ ہم نے نصف حصہ نکال لیا اور دروازہ بند کر کے کھانے بیٹھ گئے جب خوب سیر ہو چکے تو باقی ماندہ پھر پارسل میں ڈال دی۔

اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم نے پارسل کو فوراً میز کے نیچے چھپا کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک عورت ہاتھ میں بلٹی لئے کھڑی ہے میں نے پوچھا کیا چاہتی ہو؟ عورت بولی، میرا پارسل نہیں آیا؟ یہ ہے بلٹی۔

میں نے بلٹی لے کر دیکھی تو یہ اسی مٹھائی کی بلٹی تھی۔ اب ہم لوگ گھبرا سے گئے کیونکہ پارسل کو ابھی تک ہم نے وزن پورا کر کے بند نہیں کیا تھا۔ بہر حال میں نے نہایت بے پروائی سے عورت کو کہا کہ یہ پارسل ابھی نہیں آیا کل آنا۔

عورت بولی۔ کیوں نہیں آیا؟ چٹھی تو کل سے آ چکی ہے۔ یہ کہہ کر ایک چٹھی اس نے میرے ہاتھ میں دے دی اور کہا کہ پڑھ لیجئے۔ میں نے چٹھی کھول کر پڑھی لکھا تھا۔

"میری بیٹی" لالہ دھا رام ساہوکار کے بیٹے کی شادی تھی۔ میں نے لکھا تھا کہ شادی پر آؤ کیونکہ بہت سی مٹھائی آئے گی۔ لیکن تم نہ آئیں

شادی ہو چکی ہے اور ہمارے ہاں ایک من کے قریب مٹھائی کی جھوٹ (پنجابی جھوٹھ) آئی ہے۔ اس میں سے دس سیر بھیجی جاتی ہے پلٹی ارسال ہے رسیدگی سے اطلاع دو۔

تمہاری ماں
سنتو بھنگن

یہ سننا تھا کہ ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ عورت تو چلتی بنی اور میرے دوست لگے پانی سے غرارے کرنے اور منہ میں انگلیاں ڈال ڈال کر صفائی کرنے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ بھنگیوں کے ہاتھوں کی جھوٹی مٹھائی ہمارے پیٹوں میں جا چکی تھی۔ اس دن سے ہم نے قسم کھائی کہ کبھی کسی کا پارسل نہیں کھولیں گے۔

یہ کہہ کر مقرر نے پریذیڈنٹ کی طرف دیکھا۔ پریذیڈنٹ نے سگنل آپ کیا اور بابو خورشید علی اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔ پھر بغلی دروازہ کھلا اور آواز آئی "کیلے، سنگترے، میٹھی گنڈیریاں"۔

سب لوگ پھر دوسرے کمرے میں گئے۔ اب کے پھلوں کی دعوت تھی پھل کھانے کے بعد سب لوگ اٹھے اور پریذیڈنٹ نے اعلان کیا کہ آج کا اجلاس ختم۔

میں ہال سے ہو کر گیٹ کے راستے باہر نکلنے لگے۔ وہاں "ٹکٹ کلکٹر" کھڑا ہر ایک کے ٹکٹ وصول کر رہا تھا۔ جب میں گزرنے لگا تو اس نے مجھے ٹھہرا لیا کیونکہ میں بے ٹکٹ تھا۔

جب سارے ممبر باہر جا چکے تو ٹکٹ کلکٹر مجھے صدر کی میز کے پاس لے گیا۔ وہاں اس نے ایک استعمال شدہ کتاب سے ایک مبو کاٹ کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا اس کو اپنے پاس رکھئے اور کرایہ کی فکر نہ کیجئے۔ میں اپنی جیب سے ادا کر دوں گا۔

ایک آنے کی کسر

لائل پور میں ایک انجمن ترقی اُردو قائم ہے۔ اس کے منتظمین ہر سال شاندار ادبی جلسہ کیا کرتے ہیں جن میں تقریریں بھی ہوتی ہیں، قراردادیں بھی منظور کی جاتی ہیں اور مشاعرہ بھی منعقد ہوتا ہے۔ اس سال حفیظ جالندھری، جگر مرادآبادی، ساغر نظامی، احسان دانش، اوج بدایونی اور احمق پھپھوندوی نے شرکت کی۔

اس نیازمند کو بھی مدعو کیا گیا۔ انجمن کے سیکرٹری نے مجھے دس روپے کا منی آرڈر بھیج کر لکھا تھا کہ یہ کرایہ ہے۔ باقی "خدمت" لائلپور پہنچنے پر کی جائے گی۔

۲۴ فروری کی صبح کو میں سٹیشن پر پہنچا لیکن خدا جانے مجھے دیر ہو گئی یا گاڑی کو کوئی جلدی کا کام آپڑا تھا وہ مجھے ساتھ لئے بغیر روانہ ہو گئی اب دوسری گاڑی شام کو جاتی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ فرسٹ کلاس

بہت دفتر کا کام بھی کر لوں اور دوپہر کے وقت لاری پر سوار ہو جاؤں گا۔ دفتر پہنچا دفتر کا کام کیا اس کے بعد جی میں آیا کہ ایک عدد "لقلقہ" بھی ساتھ لیتا جاؤں کیونکہ مشاعروں میں لقلقہ کی نظموں کی فرمائش اکثر ہوا کرتی ہے میں نے چپراسی کو رقعہ دے کر کہا کہ اُردو اکیڈمی سے ایک جلد "لقلقہ" لے آؤ۔ لیکن چپراسی لقلقہ لے کر اُس وقت آیا جب کہ نہ لاری مل سکتی تھی نہ ٹرین۔ میں مجبوراً گھر پہنچا۔

اگلے دن گھر سے روانہ ہوتے وقت سوچا کہ فالتو پیسے ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ کرایہ اور چند آنے پان سگریٹ کے لئے کافی ہوں گے۔ چنانچہ یہی کیا اور ٹکٹ خرید کر ٹرین میں سوار ہوا۔ گاڑی میں دو لڑکے بیٹھے تھے۔ ٹرین کے ساتھ دو ٹی ٹی بھی تھے۔ جب بے ٹکٹ لڑکوں کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ میں نے ان کی باتیں سن لیں وہ یہ کہہ رہے تھے کہ جب ٹی ٹی آئے تو ہم کہہ دیں کہ ہم فلاں ٹکٹ کلکٹر کے رشتہ دار ہیں۔ مجھے اُن کی حالت پر رحم آرہا تھا اور میں دل میں خیال کر رہا تھا کہ ٹی ٹی ان کی بات نہیں مانیں گے اور بیچارے پکڑے جائیں گے۔

جڑانوالہ اسٹیشن آنے ہی کو تھا کہ ایک ٹی ٹی ہمارے ڈبے میں آگیا جب چیک کرتے کرتے ان لڑکوں کے پاس پہنچا تو انہوں نے وہی کہا جو سوچ رکھا تھا۔ ٹی ٹی نے اُن کو چھوڑ دیا۔ اور میرے پاس آیا۔ میں نے ٹکٹ دکھا دیا تو ٹی ٹی بولا کہ آپ نے بھنگ تو نہیں پی رکھی ہے میں نے حیرت سے پوچھا

وہ کیوں ٹی ٹی بولا کہ آپ کو شیخوپورہ سے ٹرین بدلنی چاہیئے تھی۔ اتنے میں جڑانوالہ سٹیشن آگیا اور ٹی ٹی نے مجھ سے کہا کہ مہربانی کر کے نیچے اتر یئے تاکہ آپ سے کرایہ چارج کیا جائے میں نے ان لڑکوں کی طرف دیکھا جو بغیر ٹکٹ ہونے کے باوجود چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اور اب مجھے اپنے آپ پر رحم آنے لگا کہ با ٹکٹ ہونے کے باوجود چور پکڑا گیا ہوں۔

پلیٹ فارم پر دوسرا ٹی ٹی بھی آگیا اور دونوں نے میرے معاملہ پر غور کیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ غور ہمدردانہ تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ آپ اس ٹرین کے ذریعہ لائل پور جانا چاہتے ہیں تو آپ کو تین ساڑھے تین روپے اور دینے پڑیں گے کیونکہ آپ شیخوپورہ سے جڑانوالہ تک بے ٹکٹ متصور ہوں گے یہ کرایہ بھی معہ جرمانے کے وصول کیا جائے گا اور آگے وایا شورکوٹ لائلپور کا کرایہ بھی لیا جائے گا۔ میں یہ سنکر بکھر اگیا کیونکہ میرے پاس فالتو پیسے نہ تھے۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی صورت میرے بچاؤ کی بھی ہوسکتی ہے؟ ایک ٹی ٹی نے ذرا سوچنے کے بعد کہا کہ آپ اسی سٹیشن پر اتر جائیے اور جڑانوالہ سے لائل پور تک لاری کے ذریعہ پہنچیے۔ یہ تجویز سن کر میری جان آئی اور میں ان ٹی ٹی صاحبان کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہوا لیکن میں نے سوچا کہ اگر گیٹ کے راستے باہر گیا تو ممکن ہے ٹکٹ کلکٹر بھی شیخوپورہ سے جڑانوالہ تک بے ٹکٹ تصور کر کے کرایہ چارج کرے میں پلیٹ فارم کے ایک طرف چل پڑا اور جنگلے کے اوپر سے باہر نکل گیا۔

موٹروں کے اڈہ پر پہنچ کر میں نے دریافت کیا کہ لائل پور تک کا کرایہ کس قدر ہے؟ جواب ملا چھ آنے میں نے اپنی جیب کا معائنہ کیا تو پانچ آنے نکلے۔ میرا رنگ فق ہو گیا کہ اب ایک آنہ کی کسر کہاں سے پوری کی جائے؟

ایک لاری تیار کھڑی تھی میں نے سوچا کہ ڈرائیور سے اپنی مصیبت بیان کروں شاید وہ پانچ آنے پر رضامند ہو جائے۔ لیکن دل نہ مانا کیونکہ یہ کام ڈرائیور کا نہ تھا بلکہ اس کا جو سامنے بکنگ آفس میں ٹکٹ بیچ رہا تھا۔ میں اس طرف گیا وہاں ٹکٹ خریدنے والوں کی بھیڑ تھی میں کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا کہ بھیڑ چھٹے تو بکنگ منشی سے عرض حال کروں لیکن بھیڑ کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی گئی۔

میں مایوس ہو گیا اور بازار کی طرف روانہ ہوا تاکہ کسی دکاندار سے اپنا قصۂ غم بیان کر کے ایک آنہ حاصل کروں۔ لیکن بازار تمام سنسان، جڑانوالہ میں مکمل ہڑتال تھی۔ میں نے خیال کیا آنکھیں بند کر کے اور ہاتھ پھیلا کر سڑک کے ایک طرف کھڑا ہو جاؤں۔ شاید کسی کو "سفید پوش اندھے" پر رحم آ جائے لیکن دل نے یہ بھی گوارہ نہ کیا۔

پھر موٹر کے اڈے پر پہنچا۔ اڈے کے متصل مٹی کے تیل کی ایک دکان تھی جس کے باہر تین چار کرسیاں پڑی تھیں اور دکان کے مالک ایک سکھ صاحب دھوپ میں اپنے کیس سکھا رہے تھے۔ دل نے چاہا کہ ایک آنہ ان سے مانگ لوں۔ میں سوال کی غرض سے ان کے قریب گیا

لیکن حوصلہ نہ پڑا اور واپس آگیا۔ اس کے بعد دفعتہً یہ خیال سوجھا کیوں نہ سردار صاحب سے اخبارات کے ایجنٹ کا پتہ دریافت کیا جائے۔ اخباروں کے ایجنٹ میرے نام سے واقف ہی ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ "شہباز" کا ایجنٹ بھی ہو جس میں میں کام کرتا ہوں۔

یہ بات سوچ کر میں سردار صاحب کے پاس گیا۔ میں نے پوچھا کہ کیوں سردار صاحب یہاں اخبارات کا ایجنٹ کہاں رہتا ہے؟ میری یہ بات سن کر سردار صاحب دکان کے اندر گئے اور اندر سے "ٹریبیون" اخبار لاکر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔ لیجئے اخبار پڑھنا ہے تو یہ حاضر ہے اور یہاں کسی ایجنٹ وغیرہ کی دکان نہیں۔ ایک دو ہاکر ہیں۔ وہی چل پھر کر اخبار بیچتے ہیں۔

میری یہ اسکیم بھی ناکام رہی اور میں اخبار لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سردار صاحب سمجھ رہے تھے کہ میں اخبار پڑھنے کا بڑا شوقین ہوں اور اخبار کے مطالعہ میں غرق ہو گیا ہوں۔ لیکن میں دل میں ایک آنہ پیدا کرنے کی تجاویز سوچ رہا تھا۔ سردار صاحب نے آخر مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہیں۔ کہاں جائیں گے اور کیا کام کرتے ہیں میں نے عرض کیا کہ لاہور سے آیا ہوں لائلپور جاؤں گا اور اخبار نویس ہوں "شہباز" کا جائینٹ ایڈیٹر ہوں اتنے میں سردار صاحب نے ایک آدمی کو جو ادھر سے گزر رہا تھا آواز دی اور کہا کہ ادھر آؤ یہ ایڈیٹر صاحب بیٹھے ہیں۔ ان سے ملاقات کرو۔ ان مہاشہ جی نے گاندھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ان سے ملاقات ہوئی کہنے لگے کہ یہاں

ہیں اخبارات بیچتا ہوں۔ پھر انہوں نے نام پوچھا تو میں نے کہا کہ "حاجی لق لق" اس پر تو مہاشہ جی اچھل پڑے اور کہا کہ آپ کے درشن کہاں پائیے؟ وہ تو میری خیر خیریت پوچھ رہے۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک آنہ کس طرح مانگوں؟

سڑک کے پار ایک مکان سے ایک اور سردار صاحب نکلے مہاشہ جی نے ان کو بھی آواز دی اور کہا کہ آیئے آپ کو ایک مشہور ہستی کے درشن کرائیں یہ سردار صاحب بھی آئے اور تعارف ہوا۔ سردار جی بولے کہ آپ کو مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں یہاں یونائیٹڈ پریس کا نمائندہ ہوں۔ ایک عدد چھاپہ خانہ بھی رکھتا ہوں میں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

سردار امر سنگھ دیہ ان کا نام تھا) ہاتھ جوڑ کر بولے کہ کیا خدمت کروں جی میں آئی کہہ دوں ایک آنہ عنایت کرو۔ لیکن پھر سوچا کہ ذرا صبر سے کام لو۔ سردار امر سنگھ یہ کہہ کر چل دیئے کہ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ چند منٹ کے بعد سردار صاحب آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک تھال تھا۔ جس میں حلوا، پوری، اچار اور گوبھی کا پلاؤ تھا۔ میں نے سردار صاحب کا شکریہ ادا کر کے یہ چیزیں کھانی شروع کردیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ سوچتا جا رہا تھا کہ آنہ کس طرح مانگوں؟ لاری جا چکی تھی اور دوسری تیار تھی۔ سردار صاحب یہ کہہ کر لاری کی طرف چلے گئے کہ میں آپ کے لئے سیٹ رکھوالوں۔ سردار صاحب سیٹ رکوا آئے اور کہنے لگے کہ آپ سے ٹکٹ

خرید لیا ہے ؟ میں نے کہا کہ ابھی نہیں ۔ آپ بولے کہ لائیے مجھے پیسے دیجئے میں ٹکٹ لے آؤں ۔ اب میرا رنگ اڑ گیا ۔ بہرحال میں نے کوٹ کی اوپر والی جیب سے پانچ آنے نکال کر سردار صاحب کے ہاتھ میں دے دیئے ۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو پانچ آنے ہیں ۔ لائل پور کے چھ آنے لگتے ہیں ۔ یہاں میرے دماغ نے تھوڑا بہت کام کیا ۔ میں نے حلوا پوری کی چکنا ہٹ سے بھرا ہوا ہاتھ دکھا کے کہا کہ کھانے سے فارغ ہوا ہوں ۔ نوٹ اندر کی جیب میں ہے اور چکنے ہاتھ نہیں لگنے چاہئیں ۔

سردار صاحب بولے کہ پرواہ نہیں ۔ ایک آنہ میں ڈال دیتا ہوں ۔ سردار صاحب یہ کہہ کر بکنگ آفس کی طرف چلے گئے اور میری جان میں جان آئی ۔ اس دن سے میں نے کان کو ہاتھ لگا لیا ہے کہ سفر میں فالتو پیسے ضرور پاس ہونے چاہئیں ۔

لیڈر بن جاؤ

اگر آپ کو دنیا میں کوئی کام نہیں ملتا تو لیڈر بن جاؤ۔ تجارت کرنے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہے۔ کھیتی باڑی کرنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے اور نوکری کی تو بات ہی چھوڑ دیجئے۔ پہلے تعلیم کی ضرورت ہے پھر سفارش کی۔ سفارش کے بغیر چپراسی کی نوکری بھی نہیں ملتی۔ ہاں لیڈری سب سے آسان چیز ہے نہ سرمائے کی ضرورت نہ محنت کی نہ تعلیم کی نہ سفارش کی۔ اور مزے ولایت پاس سے بھی زیادہ، جدھر جاؤ عزت "زندہ باد" کے نعرے، جلسے جلوس، مرغ پلاؤ۔ غرض مزے ہی مزے ہیں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ لیڈری کا نسخہ اور اس کی ترکیب استعمال کیا ہے سو پہلے یہ سن لیجئے کہ میں کس طرح لیڈر بنا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مجھے منٹگمری جانے کا اتفاق ہوا۔ شہر منٹگمری سے دس بارہ میل کے فاصلے پر میرے ایک زمیندار دوست

تھے ان سے کچھ کام تھا میں لاہور سے انٹر کلاس کے ڈبے میں بیٹھ کر منٹگمری پہنچا۔ جب گاڑی اسٹیشن پر ٹھہری تو میں نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر سینکڑوں آدمیوں کا ہجوم ہے اور بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار ہیں۔ گاڑی ٹھہری ہی تھی کہ یہ ہجوم بھاگتا ہوا انٹر کلاس کے ڈبے کی طرف آیا جس میں ایک میں اور ایک سکھ مسافر بیٹھے تھے۔ ایک معزز آدمی نے جھٹ میرے ڈبے کا دروازہ کھولا اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں باہر نکلا تو لوگوں نے میرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنا اور مصافحہ کرنا شروع کر دیا میں حیران تھا کہ ؏

"یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"

بات یہ تھی کہ اس شہر میں اسی ٹرین سے یو، پی کے مولانا رفاقت علی لاہور سے آنے والے تھے اور مسلمانوں کے ایک جلسے میں تقریر کرنے والے تھے۔ اتفاق یہ ہے کہ نہ تو مولانا کبھی پہلے منٹگمری آئے تھے اور نہ منٹگمری کے کسی شخص نے مولانا کو پہلے کبھی دیکھا تھا۔ ڈبے میں ایک میں تھا اور ایک سکھ۔ میں بھی داڑھی رکھتا تھا اور خالصہ جی بھی۔ اگر خالصہ جی اکیلے ہوتے تو شاید انہی کو مولانا رفاقت علی سمجھ لیا جاتا بشرطیکہ خالصہ جی کے کیس نظر نہ آتے۔ بہر حال مجھے مولانا صاحب سمجھ لیا گیا۔ میرے جی میں آئی کہ میں حقیقت حال بیان کر دوں اور کہدوں کہ میں مولانا رفاقت علی نہیں لیکن پھر سوچا کہ اس میں میرا بگڑتا ہی کیا ہے ایک دن لیڈری کر کے بھی دیکھ لینا چاہیئے۔ دل میں سوچا کہ تقریر کرنی

پڑے گی کیونکہ مولانا کا یہاں بلائے جانے کا یہی مقصد ہوسکتا ہے اور میں نے کبھی تقریر نہیں کی۔ تقریر کے تصوّر نے تو مجھے کپکپا دیا لیکن میں نے حوصلہ نہ ہارا اور خاموش رہا۔ دل نے کہا کہ پرواہ نہیں۔ گزارہ چل جائے گا۔ ساتھ ہی مجھے ایک لیڈر کا کہنا یاد آ گیا۔ ایک دفعہ ریل میں ایک لیڈر سے ہم سفری کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ تقریر کرنے کا گُر کیا ہے۔ لیڈر صاحب نے جواب دیا کہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور یہ تصور کر لو کہ جتنے آدمی تقریر سننے کے لئے جمع ہیں سب کے سب اُلّو اور گدھے ہیں۔ ان میں مجھ سے زیادہ لائق کوئی نہیں اس تصور کے ساتھ جو جی میں آئے کہتے جاؤ۔

بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی شخصیت کو ظاہر نہیں کروں گا لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں اسٹیشن کے باہر پہنچا تو وہاں جلوس کا انتظام تھا۔ مجھے ایک شاندار جلوس کی شکل میں شہر تک لے جایا گیا۔ راستے بھر مجھ پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی اور "مولانا رفاقت علی زندہ باد" کے نعرے لگتے رہے۔ میں نے لیڈروں کے جلوس تو کئی دیکھے تھے اس لئے وہی حرکتیں کرتا رہا جو لیڈر لوگ اپنے جلوس کے دوران کرتے ہیں یعنی مسکرا کر اور ماتھے کے قریب ہاتھ لے جاکر کبھی دائیں طرف کے تماشائیوں کو سلام اور کبھی بائیں والوں کو کورنش۔

جلوس ایک رئیس کے مکان پر ختم ہوا۔ جہاں ہم ایک اعلیٰ درجے کے فرش فروش اور فرنیچر سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور تھوڑے

عرصے کے بعد کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانے کے کمرے میں گئے تو دیکھا نوابانہ شان کے بے شمار کھانوں سے دسترخوان سجا ہوا ہے۔ کھانا کھایا چائے پی صاحب خانہ نے کہا کہ مولانا جلسے کا وقت ہو گیا ہے۔ تشریف لے چلیے۔

مجھے تشویش تو یہ تھی کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تقریب کیا ہے جلسہ کس بات کا ہے اور تقریر کس موضوع پہ کرنی ہے اگر میں نے یہ یا نہیں پوچھیں تو راز افشا ہو جائے گا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ صاحب خانہ کا بچہ کھیلتا ہوا اندر آیا۔ صاحب خانہ نے اس سے کہا کہ ادھر آؤ بیٹا۔ مولانا کی خدمت میں السلام علیکم عرض کرو۔ بچے نے میرے پاس آکر السلام علیکم کہا اور میں نے وعلیکم السلام کہہ کر اس سے ہاتھ ملاتے کے بہانے وہ اشتہار لے لیا جو اس کے ہاتھ میں تھا اور کہا کہ تم اس کو پڑھ سکتے ہو؟ لڑکے نے اٹک اٹک کر پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

۲۰ مارچ کو بعد نماز عصر مولانا رفاقت علی صاحب مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام میں ایک اصلاحی تقریر فرمائیں گے۔

اب مجھے اس اشتہار سے یہ تو پتہ چل گیا کہ اصلاحی تقریر کرنا ہے لیکن اس کا مطلب؟ اور میں اس موضوع پہ کیا کہہ سکوں گا؟ میں نے دل کو حوصلہ دیا کہ تمام حاضرین آتو ہوں گے اور میں ان سب سے لائق ہوں۔

جلسہ گاہ میں پہنچے۔ پہلے مقامی حضرات کی تقریریں ہوتی رہیں۔

اس کے بعد میں تالیوں کی گونج اور " زندہ باد" کے نعروں میں تقریر کرنے اٹھا اور یوں گویا ہوا۔

"میرے بھائیو!" میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہاں آنے اور تقریر کرنے کی عزت بخشی۔ آپ کی ہمت قابل داد ہے کہ آپ نے مسلمانوں کی اصلاح کا عزم کر لیا ہے۔ مسلمانوں کی حالت بلاشبہ قابلِ رحم ہے جو کھینچ ہیں شرابیں پیتے ہیں۔ اور سینما دیکھتے ہیں۔ سینما میں جاؤ تو دیکھو گے کہ زیادہ تماشائی مسلمان ہیں اور سینما میں ہر شب اور ہر شو میں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ الامان بھیڑ تو ریل میں بھی بہت ہوتی ہے پچھلی دفعہ جب میں جالندھر گیا تو بھیڑ کی وجہ سے ٹرین پر سوار نہ ہوسکا اور شالا مار باغ کے میلے میں بھی بھیڑ کم نہیں ہوتی۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور پولیس کے سخت انتظام کے باوجود ایسی دھکا پیل ہوتی ہے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹ جاتے ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ لاہور گئے ہیں انہوں نے شالا مار باغ ضرور دیکھا ہوگا۔ شاہانِ اسلام کی یادگار ہے۔

(نعرہ "اسلام زندہ باد")

ہر سال یہاں میلہ لگتا ہے۔ اس میلہ میں خلیفہ کے کباب اور قصوریوں کا مرغ مسلم کھانے کی چیزیں ہوتی ہیں کباب بھی عجب چیز ہے اور یہ بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ ایک انگریز نے جو ہندوستان رہ چکا ہے۔ ولایت کے ایک رسالے میں کباب پر پورے پانچ صفحوں کا ایک

مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ مہذب دنیا میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ قابلِ قدر حصہ کباب ہے۔

(نعرہ۔ اسلام زندہ باد)

کباب دراصل گھر پر اچھے نہیں بنتے۔ انہیں دکاندار ہی بنا سکتے ہیں۔ دکانداروں کی بھی کیا پوچھتے ہو۔ گزارہ ہی چلتا ہے کوئی آمدنیاں نہیں رہیں۔ آمدنی ہے تو سینما والوں کو اچھی فلم ہو یا بُری اُن کا کام خوب چلتا ہے۔ بعض فلمیں بہت مخرب اخلاق ہوتی ہیں۔ میں نے ایک فلم دیکھی۔ میرا مطلب ہے کہ ایک شخص سے اس فلم کے متعلق سنا کہ بہت ہی گھٹیا درجے کی فلم تھی اور اس سے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں وقت آگیا ہے کہ ہم اخلاق درست کریں۔

"گلدستۂ اخلاق" میں لکھا ہے ۔۔۔۔۔

میں اسی طرح تقریر کرتا گیا اور میں یہ دیکھ کر حیران تھا کہ لوگوں پر میری تقریر کا بہت اثر ہو رہا ہے۔ وہ بُت بنے ہوئے ایک ایک لفظ کو غور سے سُن رہے ہیں اور کبھی کبھی "زندہ باد" کا نعرہ بھی لگ جاتا ہے۔

میں ابھی تقریر کر ہی رہا تھا کہ ایک ٹیلیگراف کا ہرکارہ آیا اور صدر جلسہ کے ہاتھ میں ایک تار دے کر چلا گیا۔ صدر جلسہ نے تار کھولا۔ اُسے پڑھا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ لیکن میں نے تقریر کو جاری رکھا۔

جب تقریر ختم ہو گئی تو صاحب صدر نے اُٹھ کر حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا۔

"صاحبان! میں آپ کو ایک عجیب بات سناؤں۔ جن صاحب نے ابھی آپ کے سامنے تقریر کی ہے یہ مولانا رفاقت علی نہیں۔ مولانا کا تار ابھی ابھی آیا ہے جو میرے ہاتھ میں ہے۔ مولانا اطلاع دیتے ہیں کہ ہیں دفعتہً علیل ہو جانے کے باعث نہیں آ سکتا۔ بہرحال نقلی مولانا رفاقت علی کو بھی داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے اپنا پارٹ خوب نبھایا اور تقریر سے جو نور علیٰ نور تھی آپ کو محظوظ فرمایا۔ میں اب جلسے کی برخاستگی کا اعلان کرتا ہوں"

میں رات کو وہیں سویا اور صبح اپنے دوست کے گاؤں کو روانہ ہوا لیکن اس واقعہ سے مجھے شوق پیدا ہو گیا کہ لیڈر بننا چاہیئے چنانچہ میں لیڈر بن گیا ہوں۔ آپ کو لیڈر بننا ہو تو اسی طرح بن جائیے جس طرح میں بنا ہوں۔

"لیڈری زندہ باد"

سبزی کانفرنس

"شاہکار" کی یہ اشاعت بہار نمبر ہے۔ اس لئے میں نے اس پرچے کے لئے ایسا موضوع منتخب کیا ہے جس کو بہار سے تعلق ہو۔ موسم بہار سے صرف پھول پتوں کو ہی تعلق نہیں بلکہ سبزیوں کا بھی بہار سے قریبی رشتہ ہے۔ آج میں بہاری اور بہاری سبزیوں کی اس کانفرنس کا ذکر کروں گا، جو حال ہی میں ایس، پی، ایس کے ہال میں منعقد ہوئی:۔

قصہ یوں ہوا کہ ملٹری کا ایک ٹھیکہ دار لاہور کی سبزی منڈی میں اکٹھی سبزی خریدنے آیا۔ جونہی اس نے منڈی کے اندر قدم رکھا مختلف سبزیاں اسے آوازیں دے کر اپنی طرف بلانے لگیں۔ ٹھیکہ دار آلو بینگن کی طرف بڑھ رہا تھا کہ شلغم نے بڑھ کر اس کا دامن تھام لیا۔ یہ حرکت دیکھ

کر حلوا کدو شلغم سے گتھم گتھا ہو گیا۔ دوسری سبزیاں بھی ٹھیکیدار کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے بڑھیں اور سبقت کی کوشش میں ایک دوسری سے لپٹ گئیں۔ ایک کہرام مچ گیا اور ٹھیکیدار یہ حال دیکھ کر بھاگا۔ اور منڈی سے باہر نکل گیا۔

اتفاق سے سردار ہردیپ سنگھ تھانیدار تھانہ گوالمنڈی پولیس کی ایک چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ ریزگاری چھپانے والوں کے ہاں چھاپے مارنے کے لئے جا رہے تھے منڈی کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے شور و غوغا سنا تو اندر گئے اور سبزیوں کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ جب اس کا کوئی اثر نہ ہوا تو سردار صاحب نے دھمکی دی کہ آنسو رلانے والی گیس چھوڑ دی جائے گی۔ یہ دھمکی بھی بے اثر رہی تو تھانیدار صاحب نے لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور یہ فتنہ خدا خدا کر کے دبا۔

دوسرے دن منڈی کے چودھریوں نے فیصلہ کیا کہ سبزیاں ایک کانفرنس منعقد کریں۔ جس میں ان کے فوائد و نقائص کا فیصلہ کیا جائے۔ اگلے دن بازاروں میں پوسٹر چسپاں کئے گئے جن میں اعلان تھا کہ اتوار کو ایس، پی، ایس کے ہال میں ایک شاندار سبزی کانفرنس منعقد ہوگی۔

وقت مقررہ پر ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ سٹیج پر سبزیاں براجمان تھیں۔ اور نیچے سارے ہال میں تماشائی، تماشائی کون تھے؟ چمچے، چھریاں،

سل، بٹے، دیگچیاں، ہانڈیاں، چمٹو، کونڈیاں، نمک، مرچ، مصالحہ، ہلدی غرضیکہ دنیائے مطبخ کے تمام باشندے۔

کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے پیاز نے اُٹھ کر جلسے کی غرض وغایت بیان کی اور کہا کہ "سید الطعام لحم" یعنی کھانوں کا بادشاہ گوشت ہے۔ اس لئے میں تجویز کرتا ہوں کہ اس کانفرنس کی صدارت حضرت گوشت فرمائیں جنہیں اسی مقصد کے لئے خاص طور پر مدعو کیا گیا ہے۔ گوشت کی ران اچک کر کرسئ صدارت پر جلوہ افروز ہو گئی۔

صاحب صدر نے ایک مختصر سی صدارتی تقریر فرمائی اور کہا کہ جناب پیاز کی طرح میں بھی سبزیوں کے جھگڑے میں غیر جانبدار ہوں میرا ہر سبزی سے میل جول ہے اور میں سب کو محبت کے ساتھ اپنے گلے لگا لیا کرتا ہوں اپنی یہ پوزیشن واضح کرنے کے بعد میں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے صدارت کا شرف بخشا گیا ورنہ من آنم کہ من دانم۔

اس تقریر کے بعد حضرت گوشت نے کہا کہ سب سے پہلے جناب شلغم تشریف لاکر تقریر فرمائیں۔ تالیوں کی گونج میں شلغم صاحب کھڑے ہوئے اور آپ نے یوں تقریر شروع کی۔

صاحب صدر، معزز حاضرات و حاضرین میرا نام شلغم ہے اور میری خوبیاں ہر انسان پر ظاہر ہیں۔ میں جنت کی سبزی ہوں۔ جنت سے میری مراد جنت ارضی ہے یعنی کشمیر کشمیری سے میرا لطف پوچھو اور پھر میرا اچار کھا کے دیکھو۔ ہائے

کاٹ کے نہ کھا جاؤ تو میرا ذمہ۔ جو بات مجھے دُنیا بھر کی سبزیوں سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسری سب سبزیاں تو صرف زندہ انسانوں کے استعمال کی چیز ہیں لیکن مجھے مردہ بھی کھاتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ

مردہ بدریا مے رود
دیدم کہ شلغم مے خورد

یہ کہہ کر شلغم صاحب ایک طرف کو لڑھک گئے اور صاحب صدر کے کہنے پر جناب بینگن کھڑے ہوئے اور یوں بولے :-

آپ نے شلغم صاحب کی تعلیاں سنیں۔ اُن کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ جنت کشمیر کے باشندوں کا من بھاتا کھاجا ہیں لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کشمیر سے جو ہاتو آتا ہے اس کے سر پر بال نہیں ہوتے گویا شلغم کیا ہے۔۔ اچھا خاصہ بال اُڑانے کا پوڈر ہے اور پھر ایک اور بات ملاحظہ فرمائیے شلغم جب تک گوشت کے ساتھ نہ پکے اس کی کوئی لذت نہیں مجھ کو دیکھیے گوشت نہیں، تو نہ سہی، بڑیاں ڈال کر پکائیے تو سبحان اللہ! پیاز کے ساتھ پکائیے تو کیا بات ہے۔ پھر میرا بھرتہ تو ایسی چیز ہے کہ اس کا مقابلہ ہی نہیں۔ میرا ذکر بڑے بڑے شاعروں نے کیا ہے۔ مثلاً خاقانی کہتا ہے ؎

بس از سی سال یک نکتہ محقق شد بر خاقانی | کہ بورانی است بادنجان و بادنجان بورانی

ترک، عرب اور ایرانی بینگن کے اندر سے گودا نکال کر اس کی جگہ قیمہ بھرتے ہیں اور اس کھانے کو "شیخ محشی" کہتے ہیں۔ گویا مجھے "شیخ" کا رتبہ بھی حاصل ہے۔ پھر کون ہے جو میری فضیلت سے منکر ہو؟

بینگن کی تقریر ختم اور آلو کی تقریر شروع ہوئی۔ جناب آلو نے کہا:۔

واہ جی واہ! سنی آپ نے اس سیہ رو کی باتیں؟ کسی نے کہا ہے کہ "صورت بہ بیں حالش مپرس"۔ ذرا بینگن کا رنگ تو ملاحظہ ہو وہ پنجابی میں اسی کے متعلق کہا گیا ہے "نہ کہ کالا سی کلتر سی کالے پیو دا پتر سی"۔ اور اتنا بدنام کہ "تھالی کا بینگن" کہلاتا ہے۔ اور پھر اتنا گرم کہ دو تین دن لگاتار کھاؤ تو کئی بیماریاں لاحق ہو جائیں۔ مجھے دیکھو۔ ہر موسم میں ملتا ہوں یعنی سدا بہار ہوں۔ امیر غریب سب مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مسلمان، ہندو سب کے لئے یکساں ہوں۔ گوشت میں پڑتا ہوں تو مسلمان اور اچھوتوں سے ملتا ہوں تو ہندو۔ نسل کے لحاظ سے ولایتی ہوں۔ انگلستان سے آیا ہوا ہوں۔ اس لئے جس طرح انگریز ہندوستان پر حکمران ہیں اسی طرح میں بھی سبزیوں کا بادشاہ ہوں۔

یہ الفاظ سن کر ولایتی بر تن نرالی پان نے نعرہ لگایا "بادشاہ سلامت زندہ باد"۔

آلو کی تعریف کے بعد مسن مولی کھڑی ہوئی اور اس نے اپنی تقریر اس شعر سے شروع کی ؎

وہی آلو کی ترکاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے وہی کمبخت بھٹیاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

اس آلو نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ حالانکہ یہ سبزی نہ سبزی کا بھائی جہاں کوئی درخت نہ ہو وہاں خرپردھان ہوتا ہے اور جہاں کوئی سبزی نہ ہو وہاں آلو پردھان۔ پھر ایک غیر ملکی خواہ مخواہ ملک کا پردھان کیوں ہو۔ میں تو تجویز کروں گی کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے حامی آلو سے بھی پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں۔ ان الفاظ پر صاحب صدر نے مولی کو ٹوکا اور کہا کہ آپ سیاسیات کی طرف جا رہی ہیں یہ مجمع سیاسی نہیں نفس مضمون کے باہر نہ جائیے مولی نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

میں سبزی کی سبزی پھل کا پھل کچی بھی کھاؤ اور پکی بھی۔ کئی بیماریوں کا علاج ہوں اور پھر میرا ذکر تو شاعروں کے باوا آدم رودکی بھی کہہ چکے ہیں۔ ان کا مصرعہ سنئے ؎

"بوئے جوئے مولیاں آید ہمے"

اس موقع پر صاحب صدر کو ایک رقعہ دیا گیا جس میں لکھا تھا کہ سرسوں کا ساگ ابھی ابھی تشریف لایا ہے اس کا نام بھی تقریر کرنے والوں کی فہرست میں درج کر لیا جائے۔ چنانچہ صاحب صدر نے مولی کے بعد ساگ کو تقریر کرنے کے لئے کہا۔ سرسوں کے ساگ نے تقریر شروع کی۔

حضرات میں ابھی ابھی گاؤں سے شہر میں آیا تھا کہ بازار میں پوسٹر میری نظر سے گزرا جس سے سبزی کانفرنس کا علم ہوا بڑے افسوس کی بات ہے کہ مجھے اس کانفرنس کا دعوت نامہ ارسال نہیں کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مجھے سبزیوں کی برادری سے خارج

سمجھا جاتا ہے یا یہ بے توجہی شہری دیہاتی سوال کے باعث ہے
انسانوں میں شہری دیہاتی کا سوال ہو تو ہوا ہم ہیں یا امتیاز نہیں
ہونا چاہیئے اور میں اس کے خلاف پُر زور احتجاج کرتا ہوں۔ میں
کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کروں گا۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ
دیہات میں سرسوں کا ساگ ہی ایک ایسی سبزی ہے جس پر
ایک پیسہ تک خرچ کرنا نہیں پڑتا (تالیاں) اور یہی ایسی چیز
ہو جس کے کھانے سے انسان کا قبض دور ہو جاتا ہے (قہقہے)
شہر والے مجھ سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے ہیں یعنی مجھے قیمتاً
بیچتے ہیں۔ اگر کبھی سبزیوں کی بھی اسمبلی بنی تو میں ایک مسودۂ قانون
پیش کروں گا جس کے ماتحت سرسوں کے ساگ کی فروخت بند
ہو جائے۔ اس پر ٹماٹر نے اُٹھ کر کہا کہ شہری دیہاتی کا سوال
مٹ نہیں سکتا۔ شہری شہری ہیں اور دیہاتی دیہاتی۔ اگر ساگ
صاحب کو اس پر اعتراض ہے تو وہ ہال سے تشریف لے جائیں
اور اپنے گاؤں کو سدھاریں۔ اس پر بعض سبزیوں نے اعتراض
کیا اور بعض نے اس کی تائید کی۔ ہال میں تُو تُو میں میں ہونے
لگی۔ حتیٰ کہ ہاتھا پائی تک نوبت آ گئی۔ اس پر صاحب صدر نے
جلسے کو برخاست کر دیا اور سبزیاں لڑتی جھگڑتی ہال سے باہر
نکل گئیں۔

طالبِ علم ایڈیٹر

آج کل تو پنجاب یونیورسٹی نے جنرلزم کی ایک کلاس کھول رکھی ہے جس میں ایڈیٹری کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن جب ہم ایڈیٹری کے طالب علم تھے تو ہمیں ایڈیٹری اسی طرح سیکھنی پڑی جس طرح موچی یا نائی کا کام سیکھا جاتا۔ پیشہ وروں کے ہاں بچے بٹھا دیئے جاتے ہیں جو استاد کے کام کو دیکھ دیکھ کر اپنا پیشہ سیکھ لیتے ہیں۔

مجھے الٹی سیدھی مضمون نویسی تو آتی ہی تھی اس لئے ایک روزانہ اخبار میں جا بھرتی ہوا۔ چونکہ میں نوآموز تھا اس لئے میری تنخواہ اتنی ہی مقرر ہوئی جتنی جوتے گانٹھنے والا مہینے میں کما لیتا ہے۔ کام سیکھنا تھا اس لئے میں نے غنیمت سمجھا کہ چلو گھر سے کھا کے تو کام نہ سیکھنا پڑا۔

پہلے ہی دن چیف ایڈیٹر صاحب نے مجھے ایسوسی ایٹڈ کے چند تار ترجمہ

کے لئے دیئے۔ میں نے ان کو پڑھ کر دیکھا تو ایسے مشکل نہ تھے کہ میں ترجمہ نہ کر سکوں۔ مثلاً ایک تار میں لکھا تھا:۔ 500 HEAD GOATS WERE TAKEN AWAY BY THE TRIBES MEN.

اس میں ایک بھی لفظ ایسا نہ تھا جس کے معنی مجھے نہ آتے ہوں۔ میں نے قلم اٹھایا اور اس کا حسب ذیل ترجمہ لکھ دیا۔

قبائلی لوگ بھیڑوں کے ۵۰۰ سر کاٹ کے لے گئے "کاٹ کر" فالتو لفظ تھے جو میں نے اپنی گرہ سے لگا دیے کیونکہ تار میں کاٹنے کا ذکر نہ تھا۔ بہرحال میں اتنا بے وقوف نہ تھا کہ یہ بھی نہ سمجھ سکوں کہ آخر قبائلی سر ٹ لئے تو کاٹ کر ہی لے گئے ہوں گے۔

جب میں یہ ترجمہ لے کر چیف ایڈیٹر کے پاس گیا تو وہ ترجمہ دیکھ کر میرے منہ کی طرف تکنے لگا۔ میں حیران تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ مجھے اطمینان تھا کہ میں نے کسی ایک لفظ کا ترجمہ بھی غلط نہیں کیا۔ اس وجہ سے چیف ایڈیٹر کی نگاہیں مجھے اچھی معلوم نہ ہوئیں۔ آخر اس نے کہا "تمہاری انگریزی تعلیم کہاں تک ہے" میں نے جواب دیا کہ مڈل پاس ہوں چیف ایڈیٹر مسکرایا اور بولا معلوم ہوتا ہے کہ "تم پڑھا کوؤں کے کوٹھے میں پڑھے ہو"

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیا ہے آخر چیف ایڈیٹر بولا۔ ارے میاں مویشیوں کے ساتھ HEAD کا لفظ اسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح اردو میں "راس" کا۔ مثلاً ایک راس بیل۔ ایک راس گدھا۔ ایک راس گم۔

یہ ایڈیٹری کا پہلا سبق تھا۔ دوسرے دن ایک تار میں یہ الفاظ تھے

HIS 15 YEARS OLD SON یہ سارے الفاظ اتنے آسان ہیں کہ چوتھی پانچویں جماعت کا طالب علم اِن کا ترجمہ کرسکتا ہے اور پھر میں تو ایک دم مڈل پاس تھا۔ میں نے اس کا یہ ترجمہ لکھا:۔

"اس کا پندرہ سال بڈھا لڑکا"

اب یہ ترجمہ لے کر چیف ایڈیٹر صاحب کے پاس گیا تو وہ بولا "ارے بھئی! ایڈیٹری کرنا کیا ضروری ہے؟ تمہارے لئے یہ اچھا ہے کہ دلی دروازے کے باہر پان کی دکان کرلو"

اس دفعہ مجھے بھی ذرا سا غصہ آگیا۔ اور میں نے کہا۔ کیوں جناب! کیا غلطی ہے آپ ہی بتائیے کہ HIS کے معنی "اس کا" نہیں؟ پندرہ نہیں؟ YEARS کا ترجمہ "سال" نہیں؟ اور OLD "بڈھے" کو نہیں کہتے ہیں اور SON کے معنی "بیٹا" نہیں۔

چیف ایڈیٹر "ہاں ہاں" کرتا گیا لیکن آخر میں بولا کہ ترجمہ پھر غلط ہے۔ میں نے پوچھا "وہ کس طرح"؟ اس نے جواب دیا کہ "بھلے مانس پندرہ سال کا آدمی بھی بڈھا ہوتا ہے"؟ میں نے کہا "نہیں تو لیکن یہ تار کے حروف کی غلطی ہے۔ میری نہیں۔ دراصل ۱۱۵ ہوگا۔ تار والوں نے ایکا اڑا دیا ہے"۔

اس پر چیف ایڈیٹر نے قہقہہ لگایا اور شفقت آمیز لہجہ میں کہا کہ بھائی یہاں OLD کے معنی عمر ہیں۔ اس کا ترجمہ ہوگا "اس کا ۱۵ سال عمر کا لڑکا"۔

میں نے عرض کیا کہ کس کی بات مانی جائے ۔ ماسٹر کی یا ایڈیٹر کی۔ ماسٹر نے تو ہمیں OLD کے معنی "بڈھا" ہی بتائے تھے ۔ بہر حال دونوں ٹھیک ہیں " ڈ " دونوں میں شامل ہے ۔

ایک دن چیف ایڈیٹر نے مجھے نصیحت کی کہ ترجمہ کرتے وقت اپنی اردو تحریر میں خوبی پیدا کیا کرو ۔ یہ ضروری نہیں کہ ترجمہ بالکل لفظی ہو آزاد ترجمہ ہونا چاہیئے ۔

اس نصیحت کے بعد جو تار ہمارے پاس ترجمہ کے لئے آیا وہ صرف دو سطروں پر مشتمل تھا جس میں لکھا تھا کہ بارش کے باعث پالم پور کے قریب ایک ندی کا پل ٹوٹ گیا ۔

میں نے سوچا کہ اس تار کے ترجمہ میں چیف ایڈیٹر صاحب کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیئے ۔ چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کر قلم اٹھایا اور لکھا :-

رات کا بھیانک سماں ، ہر طرف تاریکی ، خوفناک تاریکی ۔ ندی کی سطح پر ابھی چند گھنٹے پہلے آفتاب کی سنہری کرنیں رقص کر رہی تھیں لیکن اب اس پر ظلمت چھائی ہوئی تھی ۔ سکوت طاری تھا صرف اس سکوت کی لہر کو پانی کی لہریں توڑ رہی تھیں جو بچوں کی طرح مچل کر ایک دوسری سے کھیل رہی تھیں ۔ دفعتہً شمال کی طرف سے گرجتا ہوا ابر اٹھا ۔ بجلی کوندنے لگی اور آن کی آن میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ۔ جل تھل ایک ہو گئے اور ندی میں اس قدر طوفان اٹھا کہ اس کے شور سے کان پڑی آواز

سنائی نہ دیتی تھی۔ اتنے میں پانی کا ایک ایسا زبردست ریلا آیا
کہ ندی کے پل کو پرکاہ کی طرح بہا کے لے گیا وغیرہ

یہاں میں نے اختصار سے کام لیا ہے لیکن اصل ترجمہ پورے فلسکیپ کا غذ پر سما سکا۔ میں مطمئن تھا کہ آج چیف ایڈیٹر صاحب بہت خوش ہوں گے۔ چنانچہ میں یہ فلسکیپ کا غذ اور اس کے ساتھ تار کا چھوٹا سا پرزہ لے کر چیف ایڈیٹر کے کمرہ میں گیا۔ اُس نے پہلے تار کو پڑھا پھر ترجمہ کو، وہ پڑھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ جب ختم کر چکا تو اُس نے سُرخ پنسل اٹھائی اور کاغذ کی پیشانی پر لکھ دیا " پہلا باب" اور مجھ سے کہا کہ اچھا ناول ہے اسے ختم کرو۔

ترجمہ کے مراحل سے گزرنے کے بعد " رپورٹنگ " کا کام میرے سپرد ہوا۔ میں جلسوں میں جاتا اور ان کی روئیداد لکھ کر دفتر لاتا۔ سیاسی لیڈروں کے پاس جاتا اور مختلف سیاسی واقعات کے متعلق ان کی رائے قلمبند کرتا ایک سیاسی لیڈر کی تقریر رٹ رکھی ہے، صرف موضوع کے مطابق اس میں تھوڑا سا تغیر و تبدل کر لیتا۔

ایک دفعہ ان صاحب نے باغبانپورہ میں تقریر کرنی تھی۔ شام کے وقت باغبانپورہ جانے لگا تو راستہ میں ایک دوست مل گئے اور مجھے ورغلا کے اپنے ہاں لے گئے۔ میں نے بھی سوچا کہ تقریر تو وہی ہوگی جو ہمیشہ ہوا کرتی ہے۔ صرف اس میں شہید گنج کا اضافہ ہوگا۔ میں دو تین گھنٹے اپنے دوست کے ہاں بیٹھا رہا اور وہیں بیٹھے بیٹھے میں باغبانپورہ کی تقریر

مرتب کرلی۔ دہاں سے اٹھ کر دفتر پہنچا اور رپورٹ نائب ایڈیٹر کے حوالے کردی۔

اگلی صبح کو ہمارا پرچہ نکلا تو یہ تقریر پوری کی پوری ہنگامہ خیز عنوانات کے ساتھ شائع ہوئی۔ عنوان یہ تھے۔

"خدا کا گھر قیامت تک خدا کا گھر ہے"۔

"دنیا کی کوئی حکومت مسلمانوں سے مسجد شہید گنج نہیں چھین سکتی"

"مسلمان مسجد کو حاصل کرنے کے لئے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے"

"باغبانپورہ میں حضرت...... کی ولولہ انگیز تقریر"

لیکن جب میں نے دوسرے اخبارات دیکھے تو ان میں لکھا تھا کہ:۔

حضرت...... علالت کی وجہ سے باغبانپورہ میں تقریر نہیں کرسکے، آیندہ تاریخ کا اعلان بعد میں ہوگا۔

شاعر کی ڈائری

۲ رمئی :- میں آج بے حد متفکر بیٹھا ہوں - پندرہ روپے مکان کا کرایہ دینا ہے اور کرایہ ادا کرنے کی تاریخ میں ایک ہفتہ باقی ہے - بجلی کا بل بھی ادا نہیں کیا - بجلی کے دفتر سے دھمکی آچکی ہے کہ اگر ایک ہفتے کے اندر بل ادا نہ کروگے تو کنکشن کاٹ دیا جائے گا - کم از کم بیس روپے چاہئیں لیکن یہ آئیں کہاں سے ؟ تنخواہ کا دن ابھی دور ہے اور دفتر والوں نے اڈوانس دینا بند کر رکھا ہے - کیا کیا جائے ؟

۳ رمئی :- ڈاک آئی - ایک چٹھی ملی جسے کھول کر پڑھا تو دل باغ باغ ہے - خدا کسی کے کام نہیں رکتا - وزیر آباد کی " بزم شعر" کے سکرٹری صاحب لکھتے ہیں کہ ۵ رمئی کو ہمارے ہاں عظیم الشان مشاعرہ ہے ضرور تشریف لائیے - پچیس روپے پیش کئے جائیں گے - مشاعرہ شام کے

چھ بجے ہے۔

۴ رمئی:۔ دفتر کا کام ختم ہو چکا ہے لیکن میں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ "بزمِ شعر" کے سیکرٹری نے کرایہ کیوں نہیں بھیجا؟ ڈاک آئی اور ایک چٹھی اور ملی۔ یہ گوجرانوالہ کی "مجلس اردو" کی طرف سے ہے۔ گوجرانوالہ میں بھی مشاعرہ ہے۔ ۶ رمئی کو سیکرٹری صاحب نے لکھا ہے کہ فکر نہ کیجئے نذرانہ پیش کرنے میں تنگدلی سے کام نہیں لیا جائے گا۔ پہنچئے ضرور۔ یہ خط پڑھ کر دل میں کہا کہ خدا جب دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اب سارے کام ہو جائیں گے۔

۵ رمئی:۔ میرا ارادہ ریل سے وزیرآباد جانے کا تھا لیکن ایک دوست نے مشورہ دیا کہ ریلیں آج کل بہت لیٹ پہنچتی ہیں۔ بس خوب رہے گی۔ میں نے ان کا مشورہ مان لیا اور بس میں سوار ہو گیا۔ لاری کوئلے سے چلتی تھی اور گوجرانوالے تک بڑے مزے سے چلی لیکن گوجرانوالے کے اڈے سے کوئی دو میل چل کر ایسی ٹھہری کہ "گل محمد" بن گئی ؂

"زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد"

ڈرائیور نے بہتیری کوشش کی کوئلے تازہ ڈال کر سلگائے پرزوں کی دیکھ بھال کی لیکن لاری نے نہ چلنا تھا نہ چلی سارے مسافر سڑک پر درخت کے سائے میں بیٹھے لاری کو کوس رہے تھے۔ آخر ڈرائیور نے تنگ آ کے سب سے کہا کہ میرے کلینر کو ساتھ لے جائیے اور گوجرانوالے جا کر ہمارے دفتر سے اپنے باقی دام لے لیجئے۔ گرمی کی شدت میں ہم لوگ گوجرانوالے پہنچے۔ دام لئے

اور سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے ٹرین ایسے وقت وزیرآباد پہنچتی تھی کہ میں مشاعرے میں شریک نہ ہو سکتا تھا۔ آخر ایک اور لاری ملی اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ لیکن میری بدقسمتی کہ یہ لاری بھی آٹھ دس میل چل کر بگڑ گئی اور اس کی مرمت ہوتے ہوتے چھ بج گئے اور میں ۹ بجے سے پہلے وزیرآباد نہ پہنچ سکا مقام مشاعرہ پر گیا۔ وہاں اُلّو بول رہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مشاعرہ آٹھ بجے ہی ختم ہو گیا تھا۔

اب میں حیران تھا کہ کہاں جاؤں۔ واپسی کے لئے جیب میں پائی نہیں۔ آخر پوچھتے پچھاتے سیکرٹری صاحب کے گھر پہنچا۔ ملاقات ہوئی میں نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے چین بجبیں ہو کر کہا واہ جی واہ! آپ نے ہماری خوب بے عزتی کرائی۔ سب لوگ ہمیں گالیاں دے رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ حاجی لق لق کا نام یونہی اشتہار میں لکھ کر لوگوں کو دھوکا دیا گیا ہے۔

میں نے سارا قصہ بیان کیا لیکن اس کا فائدہ کیا تھا۔ سیکرٹری صاحب نے بیٹھک میں بٹھایا کھانا کھلایا۔ اور میں یہ سوچتا ہوا سو گیا کہ مجھے کچھ ملے گا بھی یا نہیں۔

۶ مئی۔ صبح سیکرٹری صاحب آئے۔ میں نے اجازت چاہی انہوں نے فرمایا کہ بہت بہتر لیکن چونکہ آپ مشاعرے پر نہیں آسکے اس لئے معاف کیجئے کہ آپ کو پیسوں ویسوں کا کوئی حق نہیں۔ بہر حال یہ کرائے کے دام لے لیجئے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مبلغ تین روپے میرے ہاتھ میں

دے دیئے اور میں سلام علیکم کہہ کر روانہ ہوا۔

گوجرانوالے پہنچا تو ان لوگوں نے بڑی خاطر مدارات کی۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ مجھے تیس روپے سے کم نہ دیں گے۔ شام ہوئی اور ہم ایک سکول کے ہال کو چل دیئے۔ وہاں بہت سی مخلوق جمع تھی۔ لیکن اندر تھوڑے ہی آدمی تھے۔ کیونکہ منتظمین نے ٹکٹ لگا رکھا تھا۔

ہم ہال کے اندر گئے ہی تھے کہ تمام مخلوق ایک ریلے کے ساتھ بے ٹکٹ اندر آگئی۔ نہ اب تو پولیس کا انتظام نہ بے ٹکٹوں کو نکالنے کا کوئی ذریعہ۔ منتظمین نے منت، سماجت بھی کی اور دھمکیاں بھی دیں لیکن کون سنتا تھا؟ آخر مشاعرہ شروع کر دیا گیا اور دو تین گھنٹے تک خوب رونق رہی۔

۵ رمئی:۔ صبح اٹھ کر میں نے سیکرٹری صاحب سے اجازت چاہی تو انہوں نے رونی سی صورت بنا کے کہا کہ رات جو کچھ ہوا آپ نے دیکھ ہی لیا۔ پانچ چھ روپے سے زیادہ کے ٹکٹ نہیں بک سکے اور مجلس کے پاس کوئی فنڈ بھی نہیں۔ بلکہ پچھلے مشاعرے کا تھوڑا سا قرضہ مجلس کے سر پر ہے۔ اس لئے میں نہایت شرمندگی کے ساتھ یہ حقیر سی رقم پیش کرتا ہوں۔ یہ صرف آپ کا کرایہ ہی ہے پھر کبھی آپ کو بلایا جائے گا تو کسر پوری کر دی جائے گی۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو سیکرٹری صاحب نے پانچ روپے کا نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

۸ر مئی :- سوچ رہا ہوں کہ پندرہ روپے مکان کا کرایہ دینا ہے اور کرایہ ادا کرنے کی تاریخ میں صرف ایک دن باقی ہے۔ بجلی کا کنکشن کٹنے میں بھی ایک دن باقی ہے کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟

۱۲ر مئی :- آج دفتر میں ایک مقامی کالج کے دو لڑکے آئے تھے کہنے لگے کہ شام کو ہمارے کالج ہال میں مشاعرہ ہے۔ اور ہماری بڑی خواہش ہے کہ آپ اس میں شرکت فرمائیں۔ میں نے جواب دیا کہ حاضر ہوں گا لیکن مجھے دیں گے کیا؟ طلباء بولے کہ صاحب سب شعرا مفت آ رہے ہیں اور آپ کو خوشی کے ساتھ مفت آنا قبول کر لینا چاہیئے کیونکہ ایک ہندو کالج میں "بزم ادب اردو" کا قیام غنیمت ہے۔ آپ اسے اُردو ادب کی خدمت تصور فرمایئے۔ بس ہم یہی کر سکتے ہیں کہ شام کو تانگے پر لے جائیں گے اور تانگہ آپ کو واپس چھوڑ جائے گا۔

میں نے ہاں کر لی اور شام کے وقت ایک لڑکا آیا اور مجھے تانگے میں سوار کر کے کالج لے گیا۔ مشاعرہ ہوا اور بڑا کامیاب رہا۔ لیکن جب ختم ہوا تو وہ لڑکے مجھے ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکے اور میں پیدل ٹانگیں توڑتا گھر پہنچا۔ کھانا کھانے کے بعد یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

۲۱ر جون :- آج مجھے "بزم اقبال" جالندھر کے مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے جانا تھا۔ تین چار روز پہلے بزم کے پروپیگنڈہ سیکرٹری صاحب آئے تھے اور مجھے مدعو کر گئے تھے۔ میں نے اُن سے اپنی فیس اس لئے طے نہ کی کہ جالندھر والے اس معاملے میں بہت فراخدل واقع

ہوئے ہیں۔

لاہور سے گاڑی دو بجے جالندھر جاتی ہے۔ میں دفتر میں بیٹھا دو بجے کی انتظار کر رہا تھا کہ سیکرٹری صاحب پھر آگئے اور بولے چلئے میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ میں اُٹھ کر چلنے ہی کو تھا کہ دفعتہً خیال آیا ذرا اپنے معاوضے کے متعلق اطمینان کر لوں۔ میں نے کہا کہ آپ کو میری فیس معلوم ہے؟ تو بولے معلوم تو نہیں لیکن آپ فکر نہ کیجئے آپ کو خوش کیا جائے گا۔ میں نے کہا پھر بھی کچھ بتائیے تو سہی؟ نوجوان نے جواب دیا کہ ورکنگ کمیٹی نے آپ کے لئے دس روپے مخصوص کر رکھے ہیں۔ یہ سُن کر میں نے عرض کیا کہ تشریف لے جائیے اور ارکان بزم کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیجئے۔

۲۲ رجون: سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ لوگ مشاعروں کی فیس نہیں دے سکتے تو مشاعرے کراتے کیوں ہیں؟ کیا مشاعرے کرانا کوئی کسی حکیم کا مشورہ ہے؟

۱۰ رجولائی: آج گوجرانوالے میں مشاعرہ تھا۔ لاہور اور دیگر کئی مقامات سے شعراء آئے ہوئے تھے۔ ایک شاعر صاحب نے جو لاہور میں رہتے ہیں اپنا کلام سنانے سے پہلے ایک مختصر سی تقریر فرمائی جس میں آپ نے شکوہ کیا کہ مشاعرہ کرانے والے شاعروں کو کافی معاوضہ نہیں دیتے۔ اس بات پر زور دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "صاحب آپ جتنا گُڑ ڈالیں گے اتنا ہی میٹھا ہو گا۔"

تقریب کے بعد آپ نے کلام شروع کیا۔ ابھی مطلع ہی پڑھا تھا کہ ایک نوجوان اٹھا اور اُس نے آگے بڑھ کے ایک پیسہ شاعر کو دے کر کہا کہ لیجئے جناب پہلے اپنے کلام میں تھوڑا گڑ ڈال لیجئے۔

۸ راگست :- امرت سر میں آج بڑے زناٹے کا مشاعرہ تھا۔ لاہور کے قریباً تمام مشہور شاعر جمع تھے۔ مشاعرہ کے دوران میں ایک ننھا بہت ہی حسین و جمیل لڑکا غزل پڑھنے کے لئے اٹھا۔ حاضرین نے تالیاں بجائیں۔ نوجوان نے اشعار پڑھنے شروع کئے جو بہت پختہ تھے۔ خوب داد مل رہی تھی، لیکن طنزیہ رنگ میں کسی نے کہا۔ واہ! لکھنے والے نے کمال کیا ہے۔ دوسرے نے کہا۔ اجی آپ کے استاد کی کیا بات ہے وغیرہ

اس پر صاحب صدر اٹھے اور انہوں نے طنزیہ داد دینے والوں کو ایک جھاڑ ڈالی اور کہا کہ آپ ایک نوجوان کے متعلق کیوں بدگمانی کر رہے ہیں؟ آپ کو خوش ہونا چاہئے کہ اس لڑکے نے چھوٹی عمر میں ہی اچھا شعر کہنے کی قابلیت پیدا کر لی ہے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ یہ نوجوان خود شعر کہتا ہے اور بہت اچھا شعر کہتا ہے۔"

لڑکے نے کلام پڑھنا جاری رکھا اور جب یہ مصرع پڑھا۔ تو حضرت صدر کا رنگ فق ہو گیا ؎

"حیواں اسے کہئے انسان نہیں ہو"

بات یہ ہوئی کہ "حیوان" کی ح کے نیچے کسی طرح ایک نقطہ پڑ گیا تھا یا شاید پہلے ہی کاغذ پر سیاہ بندی موجود تھی۔ نوجوان نے اسے

"چیملاں" پڑھ کر اپنی قلعی آپ کھول دی اور حاضرین نے اس قدر داد دی کہ بیچارے کو بیٹھ جانا پڑا۔

۱۵ر ستمبر:- کل فیروزپور میں مشاعرہ تھا۔ میں بھی مدعو تھا لیکن دفعتہً علیل ہوجانے کے باعث نہ جاسکا۔ آج ایک دوست مشاعرہ سے واپس آئے تو انہوں نے ایک عجیب قصہ سنایا۔

دہلی کے ایک مشہور شاعر صاحب بھی بلائے گئے تھے۔ مشاعرہ شروع تھا لیکن آپ ابھی تک ڈیرے پر تھے۔ جب کافی وقت ہوگیا تو حاضرین نے ان کا نام لے لے کر شور مچانا شروع کردیا کہ وہ کہاں ہیں؟ سیکرٹری نے کہا کہ وہ غسل فرما رہے ہیں۔ ابھی آئیں گے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد پھر شور مچا، تو سیکرٹری صاحب نے نہایت ادب سے کہا کہ کھانا کھا رہے ہیں۔ چند منٹ کے بعد آپ کے سامنے آجائیں گے

لوگوں کا اضطراب بڑھ رہا تھا کیونکہ وہ ان شاعر صاحب کو دیکھنے اور ان کا کلام سننے کے بہت شائق تھے۔ آخر خدا خدا کرکے شاعر صاحب تشریف لائے لیکن اس شان سے کہ آپ کو دو آدمیوں نے تھاما ہوا تھا بمشکل آپ کو اونچی سٹیج پر چڑھایا گیا اور کرسی پر بٹھایا گیا۔

آپ کلام سنانے کے لئے اٹھے تو حاضرین نے خیر مقدم کی تالیاں بجائیں۔ شاعر صاحب ایک منٹ تک تو کھڑے سوچتے رہے پھر ایک شعر کہا اور اس کے بعد دھڑام سے زمین پر گر گئے۔ لوگوں نے آپ کو

اٹھایا اور دونوں طرف سے آپ کو تھام کر جس طرح آپ کو لایا گیا تھا اسی طرح واپس ڈیرے پر پہنچا دیا گیا۔

میں سوچتا ہوں کہ شاعر لوگ شراب کیوں پیتے ہیں؟ اور اگر پیتے ہیں تو مشاعروں میں جاکر کیوں پیتے ہیں؟ اور اگر ایسا بھی کرتے ہیں تو مشاعرہ ختم ہونے کے بعد کیوں نہیں پیتے۔ اور پہلے ہی کیوں الّو بن جاتے ہیں۔

تمباکو کانفرنس

برطانیہ کی جنگی کابینہ نے اپنا خاص ایلچی سرسٹیفورڈ کرپس ہندستان بھیجا تاکہ وہ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں اور حکومت برطانیہ کے مابین کوئی سمجھوتہ کرادے۔

سرسٹیفورڈ کے ہندوستان پہنچتے ہی مختلف سیاسی جماعتوں نے مشاورتی کانفرنسیں منعقد کرنی شروع کردیں تاکہ اپنے اپنے حقوق متعین کرکے برطانی ایلچی کے ساتھ گفت و شنید کرسکیں۔

اس موقع پر ہندوستان کی مشہور سیاسی جماعت حقہ کانفرنس نے بھی جو ۲۵ کروڑ حقہ فیوں کی نمائندہ جماعت ہے سرگرمی دکھائی اور منٹو پارک لاہور میں ایک عظیم جلسے کا اعلان کردیا۔ تمام ہندوستان کے وزرائے کو دعوت شرکت دی گئی اور منٹو پارک میں شاندار پنڈال بنایا گیا۔

صدارت کے لئے مولانا ظفر علی خاں کا نام تجویز ہوا اور پنڈت میلا رام وفا استقبالیہ کمیٹی کے صدر بنائے گئے۔

تاریخ مقررہ پر "زمیندار" کے دفتر سے صدر منتخب کا جلوس نکلا مولانا کو عطا محمد بٹ سوداگر تمباکو کے اس تانگے میں سوار کیا گیا جس میں بٹ صاحب کے آدمی تمباکو رکھ کر شہر کے تمباکو فروشوں میں تقسیم کیا کرتے ہیں تانگے میں ایک شاندار حصہ صاحب صدر کے لئے رکھا گیا جو تمام حقوق کا صدر معلوم ہوتا تھا۔ جلوس میں ہزارہا ہندو مسلمان حقوقی شریک تھے اور قدم قدم پر "حقہ زندہ باد" مولانا ظفر علی خاں زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے اور ہر شخص کے ہاتھ میں ایک حقہ تھا اور حقہ کے کشوں سے فضا دھواں دھار ہو رہی تھی۔

جلوس شہر کے بڑے بڑے بازاروں میں چکر لگاتے لگا۔ شہر میں مختلف مقامات پر تمباکو کے پتّوں سے خوبصورت محرابیں بنائی گئی تھیں اور ان کے نام مشہور حقہ نوشوں کے نام پر رکھے گئے تھے "اقبال گیٹ" "میر نور احمد گیٹ" "ملک نور الٰہی گیٹ" "نواب مظفر خاں گیٹ" وغیرہ

جلوس ان محرابوں سے گزرتا ہوا تین گھنٹے کے عرصہ میں منٹو پارک پہنچا جہاں باقاعدہ جلسہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے مجلس استقبالیہ کے صدر نے اپنا خطبہ پڑھا جس میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد صاحب صدر نے اپنا خطبہ صدارت پڑھنا شروع کیا جس میں حقوقیوں کی بے حسی کا رونا رویا گیا تھا۔ مولانا نے کہا کہ ہندوستان میں اتنے

حقہ نوش ہیں کہ اگر ایک کش لگا کر دھواں آسمان کی طرف چھوڑ دیں تو سارے ملک کے اوپر دھویں کی ایک گھنگھور گھٹا چھا جائے لیکن افسوس ہے کہ انہیں اپنے حقوق کا کوئی خیال نہیں۔ آپ نے ہندوستانیوں کی فیشن پرستی کی مذمت کی اور کہا کہ لوگ حقے کو چھوڑ کر سگریٹ سگار اور پائپ کی طرف بھاگ رہے ہیں اور اس طرح اپنے ملک کو اقتصادی طور پر نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مولانا نے حقوقیوں کو متحد ہونے کی تلقین کی اور کہا کہ حقوقیوں کے ہاتھوں ہمارا ملک دنیا میں سر بلند ہو سکتا ہے۔ آخر میں اس بات پر آپ نے زور دیا کہ ہم ہندوستان میں اپنے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کرتے ہیں جس کا نام "حلمستان" ہو۔ مولانا کا خطبہ صدارت حلمستان " زندہ باد" کے نعروں کی گونج میں ختم ہوا۔

اس کے بعد مختلف قرار داد پیش ہو کر منظور ہوئیں۔

چونکہ علامہ اقبال مرحوم کی وفات کے بعد حقہ کانفرنس کا یہ پہلا اجلاس تھا اس لئے حاضرین نے کھڑے ہو کر علامہ مرحوم کے انتقال پر اظہار تاسف کی قرار داد منظور کی۔

اس کے بعد مولانا محمد اشرف خاں عطا معاون مدیر "شہباز" نے اپنی گڑگڑی ہاتھ میں لے کر ذیل کی قرار داد پیش کی۔

ہم ہندوستان کے ۲۵ کروڑ حقوقی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں ہندوستان میں "حلمستان" بنانے کی اجازت دی جائے

ہم سگرٹ سگار اور پائپ پینے والوں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے کیونکہ ہماری ان کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے ہم حیوانوں میں نہیں رہنا چاہتے ۔ اس لئے "چلمستان" کا مطالبہ کرتے ہیں

عطا صاحب نے یہ قرارداد پیش کرکے ایک طویل تقریر کی جس میں بتایا کہ مغربی فیشن کے تمباکو نوش حقہ نوشوں کے حقوق پر کس طرح ڈاکہ ڈالتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ ایک حقہ نوش گلی میں بیٹھا حقہ پی رہا ہوتا ہے اور ادھر سے ایک شخص ہاتھ میں سگرٹ لئے آتا ہے ۔ اس کے پاس ماچس نہیں ہوتی اس لئے وہ بغیر اجازت لئے حقے پر جھک کر چلم سے اپنا سگرٹ سلگا لیتا ہے اور اس طرح آگ کی کئی چنگاریاں غضب کر لیتا ہے ۔

تمام حاضرین نے اس قرارداد کی تائید کی ۔

اس کے بعد ملک نور الہی مالک اخبار "احسان" نے ذیل کی قرارداد پیش کی :-

لاہور میونسپلٹی سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ حقہ نوشوں کے بادشاہ حضرت علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی یادگار کے طور پر واٹر ورکس کے پاس ہی ایک "دھواں ورکس" تعمیر کرے ۔ یہ ایک اتنے بڑے حقے کی شکل میں ہو جو سارے لاہور کے حقہ نوشوں کے لئے کفایت کرے اس میں سے پانی کے نلوں کی طرح دھوئیں نلوں میں نکل کر ہر گھر میں پہنچیں تاکہ حقہ نوش اپنے اپنے گھروں یا دفتروں میں بیٹھے نلکے کی ٹونٹی گھما

کر حقہ نوشی کا لطف اٹھا سکیں۔

اس میں پنڈت ہری چند اختر نے یہ ترمیم پیش کی کہ میونسپلٹی دھوئیں کے نلکوں کا جو ٹیکس وصول کرے وہ نصف پیسہ روزانہ سے زیادہ نہ ہو۔ ترمیم شدہ قرار داد منظور ہو گئی۔

اس کے بعد لالہ امرناتھ نے ایک قرار داد اس مضمون کی پیش کی کہ حقہ نوشوں کو بکری ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ نواب مظفر خاں نے اس کی مخالفت میں تقریر کی اور رائے شماری پر یہ قرار داد منظور نہ ہو سکی۔

دو تین اور قرار دادوں کے بعد جلسہ "حقہ پائندہ باد" "تمباکو زندہ باد" "چلم گرم باد" "نیچہ گڑگڑ باد" کے نعروں میں ختم ہوا۔ اختتام کے قریب آ کر جلسہ گاہ کے ایک کونے میں کچھ گڑبڑ ہوئی۔ اور چند آدمیوں نے جو سگرٹ نوش تھے شورش بپا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حقہ بردار والنٹیروں نے ان پر قابو پا لیا اور انہیں جلسہ گاہ سے باہر نکال دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے دن لاہور کے بازاروں میں بڑے بڑے پوسٹر چسپاں پائے گئے جن میں لکھا تھا کہ حقہ کانفرنس والے سگرٹ نوشوں کے ہرگز نمائندہ نہیں۔ وہ ہمارے حقوق پر چھاپہ مارنا چاہتے ہیں اس لئے لاہور کے تمام سگرٹ نوشوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا اور اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنا چاہئے۔ اس غرض کے لئے کل ۱۵؍ مارچ کو ٹاؤن ہال میں ایک جلسۂ عام منعقد ہو گا۔ جس

میں سگار اور پائپ پینے والے حضرات کو بھی شامل ہو کر اور ہمارے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بنانا چاہیئے۔

۱۵ مارچ کو وقت مقررہ پر ٹاؤن ہال اہل جلسہ سے کھچا کھچ بھر گیا حاضرین میں تارک سگرٹ سے لے کر ہوا ناکے سگرٹ پینے والے لوگ موجود تھے۔ جلسے کا افتتاح مولانا چراغ حسن حسرت کی تقریر سے ہوا۔ مولانا نے حقے کے نقصانات اور سگرٹ کے فوائد پر بہت کچھ کہا۔ مثلاً یہ کہ حقّے کو ہر شخص منہ لگا لیتا ہے اور اس طرح بعض امراض کے جراثیم ایک سے دوسرے کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس سگرٹ جراثیم کش ہے۔

حسرت صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

حقہ کانفرنس کے اجلاس میں ایک مقرر نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا کہ ریل کے سفر میں ایک حقے والے کو فوراً ڈبے کے اندر جگہ مل جاتی ہے۔ کیونکہ سواریوں کو حقے کے چند کش لگانے کا لالچ ہوتا ہے اور وہ خود تکلیف اٹھا کر اس کے لئے جگہ بنا دیتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے لیکن کتنی بری بات ہے کہ پڑھے لکھے سفید پوش آدمی میلے کچیلے کپڑوں والے ذلیل دیہاتی کے لئے جگہ بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کے کپڑوں سے بُو آ رہی ہوتی ہے۔ اگر یہ لوگ سگرٹ کو ہی اپنا پیدائشی حق تصور کریں۔ تو ان سے ایسی ذلیل حرکت ہرگز سرزد نہ ہو۔ بہرحال ہمیں حقہ کانفرنس کے خلاف متحدہ محاذ بنانا ہے۔ خدا کا

شکر ہے کہ سگار نوش اور پائپ نوش بھی آج ہمارے ساتھ ہیں۔
ہمیں عہد کر لینا چاہیئے کہ ہم چلمستان ہرگز نہیں بننے دیں گے۔"

حسرت صاحب کے بعد شیخ فضل الٰہی سپرنٹنڈنٹ محکمہ دیہات سدھار پائپ منہ میں لئے سٹیج پر آئے۔ اور آپ نے یقین دلایا کہ تمام پائپ پینے والے سگرٹ نوشوں کے ساتھ ہیں۔ شیخ صاحب کے بعد خاں بہادر چودھری مشتاق احمد گورمانی نے اپنے سگار کے دو تین کش لگا کر ایک دھواں دھار تقریر کی اور حاضرین سے چلمستان مُردہ باد کے نعرے لگوائے۔

اس کے بعد ایک صاحب نے درخواست کی کہ مجھے بھی چند منٹ بولنے کی اجازت دی جائے۔ اجازت دی گئی۔ ان صاحب کا نام میرزا خاموش تھا۔ آپ نے کہا افسوس ہے کہ تمباکو نوشوں کے ایک بڑے طبقہ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ نہ ان کو پوسٹر میں دعوت دی گئی ہے نہ کسی دوسرے طریقہ سے۔ میں بیڑی نوشوں کا نمائندہ ہوں اور بغیر دعوت کے چلا آیا ہوں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ بیڑی نوشوں کی تعداد ہندوستان میں کتنی زیادہ ہے۔ میرزا صاحب کی تقریر کے بعد صدر جلسہ جناب حسرت نے اس فروگزاشت پر اظہار تاسف کیا اور ذیل کی قرارداد پیش کی جو بالاتفاق منظور ہوئی :-

ہم ہندوستان کے سگرٹ نوش، پائپ نوش، سگار نوش

اور بیڑی نوش، سر سٹیفورڈ کرپس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایسی تجویز منظور نہ کریں جس سے ہندوستان کے اندر چلمستان بننے کا امکان پیدا ہو جائے۔

تین چار روز بعد اخباروں میں خبر شائع ہوئی کہ سر سٹیفورڈ کرپس نے مولانا ظفر علی خاں، مولانا چراغ حسن حسرت، خان بہادر چودھری مشتاق احمد گورمانی اور میرزا خاموش کو تار بھیج کر ملاقات کے لئے بلایا ہے۔

ملاقات ہوئی جس میں سر سٹیفورڈ نے سب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ سب تمباکوی فرقے متحد ہو جائیں نہ کوئی حقہ کانفرنس ہو، نہ سگرٹ کانفرنس نہ پائپ کانفرنس۔ چلمستان، سگرستان، پائپستان وغیرہ بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ سب لوگ تمباکو کانفرنس کے نام متحد ہو جائیں اور میں ولایت جا کر برطانوی پارلیمنٹ کو اس بات پر آمادہ کروں گا کہ تمباکو کانفرنس کو آزاد کر دیا جائے اور ایک نیشنل گورنمنٹ قائم کر دی جائے۔ میں جا کر مسٹر ایمری سے پوچھوں گا کہ مردم شماری کی رو سے حقہ نوشوں، سگرٹ نوشوں وغیرہ کی آبادی کیا ہے۔ اس کے لحاظ سے آپ لوگوں کو حقوق نمائندگی دیئے جائیں گے۔ سب نے یہ کہا کہ ہم واپس جا کر کانفرنسیں کریں گے اور آپ کو فیصلے سے آگاہ کریں گے۔

یہ لوگ لاہور آکر کانفرنسیں ہی کر رہے تھے کہ سر سٹیفورڈ کرپس ولایت تشریف لے گئے۔

شاعر کا ہاتھی

آپ نے شاید میراثی کی بات سنی ہوگی نہیں تو سنئے :-

ایک میراثی کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہاتھی بخشش میں دیا۔ میراثی ہاتھی کو خوشی خوشی گھر لے گیا لیکن ہاتھی کی خوراک کہاں سے آتی؟ چند روز تو اس نے اپنے زمیندار جمانوں سے کماد وغیرہ مانگ کر گزارہ چلایا۔ اس کے بعد وہ پریشان ہوگیا۔ پریشان کیوں نہ ہوتا؟ ہاتھی رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اگر کوئی شخص حد سے زیادہ خرچ والا کوئی کام کر بیٹھے تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ بھئی فلاں نے تو ہاتھی باندھ لیا ہے۔ میراثی بیچارہ ہاتھی کا خرچ کس طرح اٹھا سکتا ہے :-

سوچ بچار کے بعد میراثی نے ایک ترکیب سوچی۔ ہاتھی کے

گلے میں ڈھول باندھ دیا اور گاؤں کے باہر لے جاکر چھوڑ دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب؟ میراثی نے جواب دیا کہ میں بھی گا بجا کے اپنا پیٹ پالتا ہوں یہ بھی گا بجا کے اپنا گزارہ چلا لے گا۔

یہ تو تھی میراثی کے ہاتھی کی بات۔ لیکن آج میں آپ کو ایک شاعر کے ہاتھی کی بات سناتا ہوں۔ پرانی بات ہے:-

لاہور میں ایک شاعر ناظم نظمی رہا کرتا تھا۔ شعر خاصا کہہ لیتا تھا اور راج دربار میں جانے کا بہت عادی تھا۔ کسی نواب راجے کی سالگرہ کا دن آتا تو وہ قصیدہ لکھ کر پیش کرنے لے جاتا اور انعام اکرام مل ہی جاتا۔ اسے زیادہ شوق نئی نئی ریاستیں دریافت کرنے کا تھا۔ جس طرح ناظم نئی ریاستوں کی جستجو میں لگا رہتا اور ایک دو سال میں ایک نئی ریاست ضرور ڈھونڈھ لیتا تھا۔ اسی وجہ سے لوگ اسے "ریاستوں کا کولمبس" کہتے تھے۔

ایک دفعہ ناظم نے ایک نئی ریاست دریافت کی اور نواب صاحب کی شان میں قصیدہ مدحیہ لکھ کر لے گیا۔ نواب صاحب بہت خوشامد پسند تھے۔ انہوں نے ناظم کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا اور درباری شاعر کا اعزاز بھی عطا فرمایا۔ ناظم نے نواب صاحب کے دیئے ہوئے انعام سے دو سال تک خوب فارغ البال کی زندگی بسر کی اور دوسرا سال ختم ہوتے

پر پھر ایک قصیدہ لکھ کر ریاست کو روانہ ہوا۔ اب کے اس نے ریاست کے وزیر اعظم کی شان میں بھی ایک قصیدہ لکھ کر ساتھ لے لیا۔

دارالخلافہ میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ نواب صاحب شکار کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ اور کئی ہفتوں تک واپس نہیں آئیں گے بہرحال وزیر اعظم نے اس کی بہت آؤ بھگت کی اور دو تین روز تک اپنے ہاں مہمان رکھا۔ ناظم نے قصیدہ سنایا۔

وزیر اعظم بہت محظوظ ہوا اور سوچنے لگا کہ کیا انعام دیا جائے؟ وہ جانتا تھا کہ نواب صاحب شاعر پر بہت مہربان ہیں۔ اس لئے اس نے شاہی فیل خانے کے داروغے کو بلایا اور کہا کہ ایک ہاتھی شاعر صاحب کو دے دو۔ اور خود اپنی جیب سے وزیر اعظم نے دو سو روپے عنایت فرما کر شاعر کو رخصت کر دیا۔ شاعر ہاتھی اور مہاوت کو ساتھ لے کر لاہور کی طرف روانہ ہوا اور جس شہر یا گاؤں سے گزرتا کتے بھونکتے ہوئے ہاتھی کے پیچھے بھاگتے لیکن ناظم اس شان سے اکڑ کر بیٹھا ہوا نظر آیا گویا تمام پنجاب کا بادشاہ ہے۔ دائیں بائیں لوگوں کی طرف اس طرح دیکھتا گویا یہ سب لوگ زمین کے حقیر باشندے ہیں اور وہ خود کوئی آسمانی مخلوق۔

کئی دن کے سفر کے بعد لاہور آیا اور ہاتھی پر چڑھا چڑھایا

گھر کے دروازے تک پہنچا۔ بازاروں میں لوگ اسے ہاتھی پر سوار دیکھتے تھے اور طرح طرح کے آوازے کستے تھے۔ ایک نے کہا۔ اجی ناظم صاحب! یہ کس کا ہاتھی چرا لائے۔ کوئی کہتا ناظم مہاوت کا کام سیکھ رہا ہے۔ ایک بولا۔ اجی نہیں سرکس میں نوکر ہو گیا ہے۔

غرض مہاوت نے ہاتھی کو ناظم کے گھر کے سامنے میدان میں باندھ دیا اور ناظم کھانا کھانے کے بعد مہاوت کو ساتھ لے کر راتب خریدنے گیا اور ہر روز شوق کے باعث خود ہاتھی کی خوراک خریدنے جاتا۔ چند روز میں اس نے شہر کے تمام گنّے ہاتھی کو کھلا دیئے اور پھر قریبی دیہات کا رُخ کیا۔ جو کچھ بھی ملتا لے آتا اور ہاتھی کا پیٹ بھرتا۔ لیکن تا بہ کجے؟ کوئی ڈیڑھ دو مہینے میں دو سو روپے جو وزیر اعظم نے دیئے تھے ہاتھی کے پیٹ میں چلے گئے اور ناظم گھبرا گیا کہ یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی! جس دوست کو اپنا دکھڑا سناتا وہ پھبتیاں کستا۔ ایک نے کہا کہ میاں ادنے پونے کر کے ایک بگھی کا رتھ بنوا لو اور ہاتھی کو اس کے آگے جوتو۔ دن میں سواریوں کے تین چار پھیرے بھی باغبانپورہ تک کے لگ گئے تو گزارہ چلتا جائے گا۔ ایک نے مشورہ دیا کہ کھیتوں میں کھلا چھوڑ دو۔ پولیس پکڑ کے کانجی ہاؤس بھیج دے گی اور تمہارے گلے سے یہ جنجال اُتر جائے گا۔

کئی دن سوچنے کے بعد اسے یہ کانجی ہاؤس والی تجویز پسند آئی۔ اس نے ہاتھی کو باہر لے جا کر کھلا چھوڑ دیا۔ ہاتھی نے کھیتوں کا رُخ کیا۔ جدھر گیا کھیتوں کی تباہی کرتا گیا۔ زمینداروں نے کوتوال صاحب سے شکایت کی۔ کوتوال صاحب نے پولیس بھیج کر ہاتھی پکڑوا منگایا اور اسے ناظم کے مکان کے سامنے بندھوا کر ناظم کو گرفتار کر لیا۔ ناظم بہت سٹپٹایا کہ ہاتھی کو کانجی ہاؤس بھجوانے کے بجائے میں خود کانجی ہاؤس پہنچ گیا۔ آخر ناظم کو اپنے ایک کرم فرما رئیس کی مداخلت سے نجات ملی۔ لیکن گھر جا کر پھر سوچنے لگا کہ ہاتھی کا کیا کروں؟ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اسے بندوق سے ہلاک کروا دو۔

ناظم کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے دل میں کہا کہ ہاتھی سے نجات حاصل کرنے کی یہ ترکیب سب سے بہتر ہے۔ چنانچہ وہ بندوق تلاش کرنے لگا۔ کئی ایسے شخصوں کے پاس گیا جو بندوق رکھتے تھے لیکن بندوق کون دیتا؟ بندوق تو نہ ملی لیکن یہ بات آہستہ آہستہ عام ہو گئی۔ حتیٰ کہ میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری نے بھی سن لی اس نے فوراً ناظم کو بلا بھیجا اور کہا کہ سنا ہے تم ہاتھی کو ہلاک کرنا چاہتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہاتھی کی لاش سے تعفن پھیلا کر شہر میں وبا پھیلانا چاہتے ہو۔ میں تمہیں میونسپل ایکٹ کی فلاں دفعہ کی رُو سے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ ناظم کے پاؤں تلے سے

زمین نکل گئی اور لگا منت سماجت کرنے۔ سیکریٹری نے حکم دیا کہ تمہاری نیت کا چونکہ مجھے علم ہو گیا ہے اس لئے تمہارا چھٹکارا صرف اس صورت سے ہو سکتا ہے کہ کل تک ہاتھی کو شہر سے نکال لے جاؤ ورنہ میونسپل ایکٹ کے ماتحت سزا ملے گی۔ ناظم نے وعدہ کر لیا کہ میں کل تک ہاتھی کو باہر بھیج دوں گا۔

گھر آیا تو سوچنے لگا کہ ہاتھی کو بھیجوں کہاں؟ اور نہیں بھیجتا تو پھر وہی پولیس اور وہی حوالات جس سے ایک دفعہ خدا خدا کر کے نجات ملی ہے۔ بیوی نے کہا کہ بھلے آدمی شہر کے کسی رئیس کو تحفہ کے طور پر دے دو۔ لیکن ناظم نے تیوری پر بل ڈال کر کہا اونہہ۔ تم مجھے بدنام کرانا چاہتی ہو؟ لوگ کہیں گے کہ ہاتھی کو سنبھال نہیں سکا اس لئے دے دیا۔ میں یہ بدنامی کس طرح گوارا کر سکتا ہوں۔ میں شاعر ہوں شاعر۔ میں کسی کی بات کب سن سکتا ہوں؟

صبح ہوئی تو ناظم صاحب نے مہاوت کو بلا کر کہا کہ نواب صاحب کی چٹھی آئی ہے۔ لکھتے ہیں کہ وزیر اعظم صاحب نے آپ کو اچھا ہاتھی نہیں دیا۔ آپ جیسے نامور شاعر کو سفید ہاتھی دینا چاہئے تھا۔ اس لئے ہاتھی واپس بھیج دیجئے تاکہ بدل دیا جائے۔

مہاوت نے کہا کہ حضور کا جیسے حکم۔ ناظم بولا کہ ابھی ہاتھی کو لے کر روانہ ہو جاؤ۔ نواب صاحب کی خدمت میں میری طرف

سے مجرا بجالانا اور دیکھو ایک ہفتے سے زیادہ نہ ٹھہرنا کیونکہ میرے بھائی کی شادی ہے اور دولھا ہاتھی پر سوار ہو کر جائے گا۔

ناظم نے دس روپے مہاوت کو زادِ راہ کے طور پر دیئے اور ہاتھی کو رخصت کیا۔ اس کے بعد توبہ کرلی کہ کبھی پھر اس ریاست میں نہ جاؤں گا۔

اڑان

بڈھا سلطان ایک درزی تھا۔ ایسا درزی کہ اس کی قینچی آسمان کا پرزہ کاٹ کر لا سکتی تھی اور اس کی سوئی اس پرزے کو پھر اپنے مقام پر سی سکتی تھی۔ وہ صرف درزی ہی نہ تھا بلکہ جہاں دیدہ ہونے کے باعث سب کچھ تھا۔ آپ کسی بیماری کا ذکر کریں، تو ایسی طبیبانہ گفتگو کرتا اور صدری کا ٹتے کاٹتے ایسے صدری نسخے بیان کرنا شروع کر دیتا تھا کہ آپ عش عش کر اٹھیں۔ اور خیال کرنے لگیں کہ شفاء الملک کا خطاب حکومت نے حکیم محمد حسن قریشی کو غلطی سے دے دیا ہے۔ اصل حقدار سلطان تھا۔

ایک دفعہ شاعری کا ذکر چل پڑا تو سلطان کہنے لگا۔ کہ بھائی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟ نہ وہ شاعر رہے نہ شاعری۔ نہ وہ مشاعرے

نہ وہ ادبی محفلیں۔ میں کبھی کبھی مشاعرے میں چلا جاتا ہوں تو بیزار طبیعت لے کر واپس آتا ہوں۔ شاعری کہاں رہی؟ اب تو گانا رہ گیا ہے۔ جو شاعر اپنے کلام کو گا کر نہیں سنا سکتا اس کو لوگ سننا ہی پسند نہیں کرتے۔ اور ان کالج کے لڑکوں سے تو خدا بچائے۔ منہ سے سٹی سٹی کر کے اور پاؤں زمین پر مار مار کر ایسا شور پیدا کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنا سا منہ لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور جو شاعر گا سکتا ہے وہ پڑھنے کے لئے اٹھتا ہے۔ تو پرجوش تالیوں سے اس کا استقبال ہوتا ہے اور اس کے ایک ایک مصرعے پر یا یوں کہئے کہ اس کی ایک ایک تان پر سامعین فدا ہو ہو جاتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ چند سال کے بعد شاعروں کو ہارمونیم اور طبلے بھی رکھنے پڑا کریں گے۔

بابا سلطان کی طبیعت بہت سلجھی ہوئی تھی۔ پڑھا لکھا آدمی تھا اور گفتگو کرنے کا بہت شوق رکھتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ بڑا باتونی تھا۔ پچھلی جنگِ عظیم میں مصر، عراق، ایران اور دیگر کئی ممالک میں فوجی درزی کی حیثیت سے رہ چکا تھا۔ اس لئے اس کے تجربات ومشاہدات کا ذخیرہ کافی سے زیادہ تھا۔ جس وقت اس کے پاس کام کم ہو جاتا، تو اسی انتظار میں رہتا تھا کہ کوئی شخص آ کے بیٹھے تو وہ اس سے بات چیت کر کے وقت گزارے۔ اس کی دکان میرے گھر کے قریب تھی۔ اس لئے میں کبھی کبھی اس کے پاس جا بیٹھتا تھا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ

تک اس کی داستانیں سناکرتا تھا۔

ایک اتوار کی صبح کو چائے پینے کے بعد میں بابا سلطان کی دکان پر جا بیٹھا۔ اس نے ایسے جوش کے ساتھ میری آؤ بھگت کی جس سے مجھ پر ظاہر ہو گیا۔ کہ آج اس کے پاس کام تھوڑا ہے۔ اور وہ اسی انتظار میں بیٹھا تھا کہ کوئی دوست آ نکلے تو گپ شپ اڑائے اس نے پہلا سوال مجھ سے یہ کیا کہ سنائیے۔ اخبار کی کیا تازہ خبر ہے؟

میں:- خبریں تو بہت ہیں لیکن سب سے زیادہ دلچسپ بمبئی کے ایک سیٹھ کے انتقال کی خبر ہے۔

سلطان:- اس میں کیا دلچسپی ہے؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ سیٹھ لوگ عزرائیل کو بھی دو چار لاکھ کا چیک دے کر ٹال سکتے ہیں۔

میں نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ سیٹھ دفعتہً دل کی حرکت بند ہو جانے کے سبب وفات پا گیا۔ سلطان بولا: جی واہ! حرکت قلب کے بند ہونے سے نہ مرتا تو بخار سے مر جاتا۔ بخار سے نہ مرتا ہیضے سے مر جاتا۔ اس نے خدا کی گورنمنٹ سے کوئی لائف سیونگ سرٹیفکیٹ تو نہیں خرید رکھا تھا؟ آخر اس کی موت میں دلچسپی کیا ہے؟

میں:- دلچسپی یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی ایک لکھ پتی سیٹھ کے باورچی کی حیثیت سے شروع کی۔ لیکن جب مرا تو کروڑ پتی آدمی تھا۔

اب خیال فرمائیے کہ وہ کیسا عجیب آدمی ہوگا؟
سلطان :- عجیب آدمی ؟ (مجھ پر اپنی علمیت کا رعب ڈالتے ہوئے) عجیب کا لفظ اس کے لئے موزوں نہیں۔ اسے باہمت آدمی کہنا چاہیئے عجیب ترین آدمی جو میرے علم میں آیا سیالکوٹ کا عیسائی نوجوان جان نامی تھا جو ایران میں خانقین کے قریب تیل کے چشموں پر ملازم تھا۔
میں نے کہا " وہ کیسے ؟ میرا اشارہ پاتے ہی سلطان نے اپنی داستان شروع کر دی :-

کرسمس کا دن تھا اور جان کے چھوٹے سے بنگلے پر اس کے دوست اور رفقائے کار ڈیوڈ، جوزف ولیم اور ایڈورڈ جمع تھے۔ یہ پارٹی برآمدے میں بیٹھی بیئر پی رہی تھی۔ یہیں سب کے کھانے کا انتظام بھی تھا اور پروگرام یہ تھا کہ کھانا کھانے کے بعد قصبہ خانقین جائیں۔ اور دن کا باقی حصہ اور رات کا کچھ حصہ وہاں کی " انڈین کلب " میں گزاریں۔

خانقین میں ریلوے نیوی فوج اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کے ہندوستانی ستاف نے مل جل کر ایک گھر بنا رکھا تھا۔ ہندو مسلمان سکھ، عیسائی تہواروں کے موقعہ پر وہاں جمع ہو جاتے اور رات کا کھانا وہیں کھایا کرتے تھے۔

بیئر اڑ رہی تھی۔ اور ڈیوڈ کے گراموفون پر ریکارڈ بج رہے تھے جب جان کے نوکر نے بارھویں بوتل کھولی تو ولیم بولا کہ بس یہ آخری

بوتل ہونی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اُلو بن کر خانقین پہنچیں۔ جوزف نے اس کی تائید کی اور کہا کہ ہمیں یہاں سے اُلو بن کر نہیں جانا چاہیئے بلکہ وہاں جاکر اُلو بننا چاہیئے۔ اس پر قہقہے بلند ہوئے۔ اور جان کے نوکر نے آکر کہا کہ صاحب کھانا تیار ہے۔ سب کے سب کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

کھانے سے فارغ ہوکر نکلے اور سب نے ایک ایک سگار سلگایا۔ کار تیار تھی۔ اور بیئر اور وسکی کا بکس بھی۔ نوکر نے بکس کار میں رکھا اور پارٹی برآمدے سے سیڑھیوں کے راستے نیچے اترنے لگی۔ اگرچہ ان میں بدمست کوئی نہیں تھا لیکن پھر بھی بیئر کافی اثر کر چکی تھی۔ سب لوگ اتر چکے اور جان ابھی تک برآمدے میں کھڑا نوکر کو ہدایت دے رہا تھا۔ نوکر اندر ہدایات سُن کر چلا گیا۔ جان سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور نیچے کھڑے ہوئے دوستوں سے کہنے لگا کہ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ میں ایک ایک سیڑھی پر پاؤں رکھ کر اترنے کے بجائے ایک ہی جست میں نیچے آرہوں گا۔ دوست علیٰحدہ ہٹ گئے اور جان نے چھلانگ لگادی۔ لیکن زمین سے لگنے کے بجائے وہ ہوا میں معلق رہ گیا۔ دفعتہ اس کے دل میں خیال آیا کہ اوہو میں ہوا میں اڑ سکتا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے ہوا میں آگے بڑھنے کی کوشش کی اور وہ کامیاب ہوا۔

اس کے دوست سیڑھیوں سے ہٹتے ہی ڈیوڈ کی رسٹ واچ دیکھنے لگ گئے تھے جو اس کی بیوی نے لکھنؤ سے کرسمس کے تحفے کے طور پر بھیجی تھی۔ اس لئے جان کی طرف کسی کا دھیان نہ تھا۔ جان زمین سے کوئی دو فٹ اونچا ہوا میں اڑتا ہوا اُن کے پاس سے گزر گیا تو ولیم کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے اپنے سگار سے جان کی طرف اشارہ کر کے کہا "دیکھو دیکھو! جان کو کیا ہو گیا۔ ابے نامعقول یہ کیا کر رہے ہو"؟

جان ہوا میں گھوما اور دوستوں کے پاس آکر اس نے زمین سے پاؤں لگا دیئے اور کھڑا ہو گیا۔ دوست حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ آخر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "میں اڑ سکتا ہوں اور دیکھا یہ کتنا آسان کام ہے"؟

جوزف نے کہا "تم مدہوش ہو گئے جان" ڈیوڈ بولا "بیشک مدہوش" جان نے دونوں کے جواب میں کہا "ہرگز نہیں" "میں مدہوش نہیں" اور ساتھ ہی حقیقت پرواز ثابت کرنے کے لئے وہ ادہر کی طرف لپکا اور ٹانگیں مارتا ہوا ہوا میں تیرنے لگا۔ اس نے اُڑتے اُڑتے بنگلے کے سارے احاطے کا چکر لگایا اور اسی حالت میں پارٹی کے پاس سے گزر گیا۔

جوزف بولا "واپس آجاؤ گدھے" کوئی تمہیں دیکھ نہ لے۔ اگر

نوکروں نے دیکھ لیا تو وہ تمہارے متعلق کیا خیال کریں گے ؟"
ڈیوڈ نے کہا "چھوڑو، چھوڑو جان، ہمیں بے وقوف نہ بناؤ"
جان نے ایک درخت کی شاخ سے جو زمین سے دس فٹ اونچی تھی۔ کچھ پھول توڑے اور واپس آکر اپنے دوستوں کے اوپر پھینک دیئے۔

ولیم نے جیب سے رومال نکالا اور اس سے منہ پونچھنے لگا۔ وہ اب بالکل صوفی تھا اور جان کی پرواز کو دیکھ کر ورطۂ حیرت میں غرق تھا۔ دوسرے ابھی تک اس عجیب و غریب حرکت کو اچھی طرح سمجھ نہ پائے تھے کہ کیا جان اُن کو بے وقوف بنا رہا تھا! جوزف کا خیال تھا کہ جان ان سے مذاق کر رہا ہے۔

جب یہ پارٹی موٹر میں سوار ہو کر خانقین کو روانہ ہو گئی تو راستے میں جان خود یہ سوچنے لگا کہ کیا میں نے فی الحقیقت پرواز کی تھی۔ یہ محض کوئی تصور ہی نہ تھا؟

کلب پہنچنے پر جب یہ لوگ اندر داخل ہونے لگے تو ولیم نے کہا کہ دیکھو جان ہمیں اندر جا کر اس واقعہ کا ذکر نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کوئی شخص یقین نہیں کرے گا۔ جان بولا کہ یقین کیسے نہیں کریں گے؟ میں ان کو اُڑ کر دکھا سکتا ہوں۔ ولیم نے کہا یہ بات تو درست ہے لیکن یہ کرسمس کا دن ہے ہم کسی قسم کی بدمزگی پیدا کرنا نہیں چاہتے فرض کرو کسی نے یہ سمجھ لیا کہ تم بھوت ہو اور خوف کے مارے بیہوش

ہو گیا یا کسی کی پتلون خراب ہو گئی ؟

جان اس بات پر رضامند ہو گیا کہ نہ وہ پرواز کا مظاہرہ کرے گا نہ اس کے متعلق کوئی لفظ زبان پر لائے گا۔ شام کی تقریب اپنے معمول کے مطابق اختتام پذیر ہوئی۔ لیکن دوسرے دن ڈیوڈ نے جو جان کے ساتھ ہی رہتا تھا پھر یہ تذکرہ چھیڑ دیا۔ دونوں اپنا علی الصبح کا دورہ ختم کرنے کے بعد اپنے بنگلے کے برآمدے میں چائے کے مزے لے رہے تھے۔

ڈیوڈ نے چائے کا پیالہ حلق کے اندر انڈیلنے کے بعد سگریٹ جلایا اور کہا یار یہ تو بتاؤ کہ تم نے ہمیں کل کس طرح بے وقوف بنایا؟ وہ اڑنے والا معاملہ کیا فریب بازی تھی ؟ جان نے خفگی کے لہجے میں جواب دیا" فریب بازی ؟ اس میں فریب بازی کی کون سی بات ہے؟ میں اب بھی اڑ کے دکھا سکتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے جلدی سے اپنا پیالہ میز پر رکھا اور اچک کر ہوا میں جا رہا۔ وہ اڑتا ہوا برآمدے کے سرے تک گیا۔ اور پھر واپس آ گیا۔ ڈیوڈ چلا اٹھا ہاں ہاں اب میں قائل ہو گیا ہوں۔ ورنہ پانچ منٹ پہلے میں یہی خیال کر رہا تھا کہ کل کا واقعہ محض ایک تصوّر تھا۔ لیکن جان یہ کچھ اچھے آثار نہیں۔ تمہیں چاہیئے کہ ڈاکٹر سے مشورہ کرو۔

جان :۔ وہ کیوں ؟

ڈیوڈ :۔ اس لئے کہ اگر کمپنی کو اس بات کا علم ہو گیا تو وہ تم کو فوراً

ملازمت سے برطرف کردے گی اور تم بھیک مانگتے نظر آؤ گے۔

جان نے اس زور سے اپنا ہاتھ میز پر مارا کہ چائے کا سامان رقص کرنے لگا اور گرج کر بولا:۔ مجھے برطرف کردیں گے؟ میں خود اپنے آپ کو برطرف کردوں گا۔ میری اس نئی قابلیت میں میرے لئے روپیہ ہی روپیہ ہے۔ میں مالدار بننے والا ہوں۔

ایک مہینے کے اندر ہی اندر جان جہاز میں سوار ہوکر بمبئی روانہ ہوگیا۔ لیکن اس وقت تک اس کی قابلیت پرواز کے متعلق بعض افواہیں مشہور ہوچکی تھیں۔ سب سے پہلے خانقین کے نزدیکی شہر کرکوک کے واحد اخبار "استقلال" کے نامہ نگار نے خانقین کے حوالے سے ایک خبر شائع کی جس کا عنوان تھا "ایک خیالی پرواز" اس خبر میں طنزاً لکھا کہ خانقین کے ہندوستانی کلب میں کرسمس کی روح پرواز کرتی ہوئی آ دھمکی۔ اس کے بعد بغداد کے ایک دو اخباروں نے اس خبر کو نقل کیا لیکن ابھی تک خبر نے سمندر عبور نہیں کیا تھا۔

جان نے بمبئی پہنچ کر سیٹھ کاکا بھائی سے خط وکتابت کی جو صوبہ بمبئی کے کئی تھیٹروں کا مالک تھا۔ اس نے اپنی چٹھی کے ساتھ پانچ سو روپیہ کا ایک چیک بھی لفافے میں بند کردیا۔ اگر میں یہ ثابت نہ کرسکا کہ میرا کام دنیا بھر میں سب سے بڑا اور عجیب وغریب کھیل ہے تو یہ پانچ سو روپے آپ ضبط کرسکتے ہیں۔

اسے ملاقات کی اجازت مل گئی اور وہ سیٹھ کے کمرے میں

داخل ہوا۔ سیٹھ نے کہا۔ تم کیا کام کر سکتے ہو؟ جان نے جواب دیا
میں اُڑ سکتا ہوں سیٹھ بولا :۔ "میں بھی اُڑ سکتا ہوں بلکہ میرا اپنا
ہوائی جہاز موجود ہے"

جان نے لفظوں پہ وقت ضائع کرنا پسند نہ کیا اور اوپر کی طرف
لپک کر ہوا میں معلق ہو گیا۔ پھر اُس نے سیٹھ کے شاندار کمرے
میں ایک پرندے کی طرح چکر لگایا اور سیٹھ کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔
سیٹھ کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کی زبان نے اسے جواب دیدیا۔
اور وہ قائل ہو گیا کہ یہ شخص فی الحقیقت اُڑ سکتا ہے۔

جان نے ہوا میں معلق رہتے ہوئے ایک سگریٹ سلگایا اور
پوچھا "کیا آپ کی تسلی ہو گئی ہے۔ یا کچھ اس سے بھی زیادہ بڑھوں
اور کھڑکی کے راستے اُڑتا ہوا باہر نکل جاؤں" سیٹھ نے عالم خوفزدگی
میں ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہا۔ خدا کے لئے باہر نہ نکلنا۔ ادھر آ
جاؤ اور میرے پاس بیٹھو۔

جان زمین پر آ رہا اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ معاہدہ لکھا
گیا جس کی رُو سے جان اس بات کا پابند تھا کہ وہ کاکا تھیٹر کے سٹیج
پر آنے سے پہلے کسی کو اپنا یہ کمال نہ دکھائے اور سٹیج پر وہ دس
دن کے بعد آئے گا تاکہ اس عرصے میں اعلیٰ پبلسٹی ہو سکے۔

سیٹھ کاکا بھائی بے حد خوش تھا۔ اس نے کہا کہ ہم پبلک کا
روپیہ بہت اچھی طرح کھینچ سکیں گے اور تم میرے تھیٹروں کو چھینوں

تک مخلوق خدا سے بھر سکتے ہو۔ یہ کہہ کر سیٹھ نے چیک بک نکالی اور پانچ ہزار روپیہ کا ایک چیک لکھ کر کاٹ دیا اور کہا یہ پہلا چیک ہے اسکے بعد اس قسم کے کئی چیک تمہاری نظر کئے جائیں گے۔

وہ دن مسٹر جان کے لئے بہت مسرت بخش تھے۔ اب وہ آئیل کمپنی کا ملازم نہیں تھا بلکہ قصر امارت کے دروازے پر کھڑا تھا سیٹھ کاکا بھائی کا معاہدہ اسے ہر ہفتہ سینکڑوں روپے دلانے لگا اس نے ایک عالیشان فلیٹ کرائے پر لے لی۔ ایک شاندار موٹر خرید لی اور اعلیٰ درجے کے سوٹوں کے آرڈر دے دیئے۔ اس نے کاکا تھیٹر میں جانا شروع کر دیا تاکہ اس فضا سے مانوس ہو جائے۔ وہ کھیل کے وقت بھی جاتا اور صبح کے وقت بھی جبکہ تھیٹر ہال خالی ہوتا۔ وہ سٹیج پر کھڑا ہو کر خالی نشستوں کی قطاروں پر نگاہ دوڑاتا اور سوچتا کہ ہزاروں آدمیوں کی نگاہیں مجھ پر جمی ہونگی اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوگئی یا میری قوت پرواز مجھے جواب دے گئی تو پھر کیا ہوگا؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا اور چند روز میں میں دنیا کا مشہور ترین انسان ہوں گا۔

مظاہرۂ پرواز کی پہلی رات آگئی۔ وہ ونگ میں کھڑا تھا۔ سٹیج کے ملازمین اور دوسرے ایکٹرا سے اچنبھے کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان میں کسی نے بھی جان کو کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ کوئی اور ایسا آدمی دیکھا تھا جو اڑ سکتا ہو۔ یہ معاملہ کیا ہے؟ سٹیج پر نہ کوئی تار ہے نہ کوئی آلہ۔ لیکن اس کے باوجود سیٹھ کاکا بھائی اس شخص کے پاس کھڑے ہیں۔

سیٹھ نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ یہ نوجوان بہت بڑا آدمی بننے والا ہے اور پھر جان سے پوچھا کہو کیسے محسوس کر رہے ہو؟ جان نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ بہت خوش ہوں حالانکہ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ سٹیج اسے بہت بڑا معلوم ہو رہا تھا اور اس کی روشنیاں بہت تیز۔

بھاری بھرکم پردہ اٹھا اور ونگ سے ایک خوش پوش آدمی آگے بڑھا۔ اس نے نہایت میٹھی زبان میں حاضرین کا تعارف جان سے کرانا شروع کیا اس نے کہا "دُنیا کا پہلا آدمی جس نے پرواز کا مسئلہ حل کیا۔ کوئی شعبدہ بازی نہیں۔ آپ پوری دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ کیا آپ میں سے آدھ درجن حضرات اپنی تسلی کرنے کے لئے سٹیج پر تشریف لا سکتے ہیں"؟

جان کے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے۔ بہرحال اس نے سر جھکا کر اور مسکرا کر حاضرین کو سلام کیا اور پُرجوش تالیوں سے اس کا جواب دیا گیا۔

اس کے بعد تعارف کرانے والے نے پھر تحقیقاتی کمیٹی کو سٹیج پر آنے کی دعوت دی اور تین چار آدمی سٹیج پر چڑھ آئے۔ انہوں نے دیکھ بھال شروع کر دی۔ ایک نے جان کے کوٹ پر ادھر اُدھر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔ اور اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک نے اس کے بوٹ کا معائنہ کیا اتنے میں "چینگڑ محلہ" سے آواز آئی۔ دیکھنا کہیں یہ کاٹ نہ کھائے۔ اس کے بعد اور آوازے کسے جانے لگے اور فضا میں پر قہقہے بلند ہونے لگے۔

تعارف کرانے والے نے پوچھا۔ کیا آپ صاحبان کی تسلی ہو گئی ہے؟

بہت خوب اب آپ اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھئے۔ مسٹر جان آپ کو دکھائیں گے کہ اڑنا کتنی آسان چیز ہے۔

جان ایک قدم آگے بڑھا۔ پھر ایک قدم اور بڑھ کر ٹھہر گیا۔ "چنگڑ محلے" سے آواز آئی "اور بڑھو۔ کیا اور نہیں بڑھ سکتے"؟ ایک اور آواز آئی "تو وا اڑا۔ اہاہاہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جان کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے اڑنا مشکل نظر آرہا تھا۔ آخر ہمت کر کے وہ اوپر کی طرف لپکا لیکن فرش پر اس طرح گرا کہ سب حاضرین قہقہے لگانے لگے۔ اور پچھلی کلاسوں والے آوازے کسنے لگے۔

جان نے پھر کوشش کی لیکن پھر اسی طرح گرا۔ اور تھیٹر ہال قہقہہ زار بن گیا۔ آوازے کسنے لگے اور نوجوان مسٹر جان ان نظاروں کو ایک دو لمحوں سے زیادہ برداشت نہ کرتے ہوئے ونگ کی طرف بھاگ گیا۔

اگلے دن اخباروں نے اس کا بے طرح مضحکہ اڑایا اور زندگی اس کے لئے ایک بوجھ ہو گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بابا سلطان یہ داستان ختم کر چکا تو میں نے پوچھا۔ کہ کیا جان پھر کبھی اڑنے کے قابل نہ ہو سکا؟ بابا نے جواب دیا۔ کبھی نہیں۔ یہ طاقت جس طرح آئی تھی اسی طرح ہمیشہ کے لئے مفقود ہو گئی۔

گھوڑے کی سواری

باتوں باتوں میں سواریوں کا ذکر چھڑ گیا۔ میرا دوست سید علی گھوڑے کی سواری کا بہت شوقین تھا اور اس نے اعلیٰ درجے کا کمیت گھوڑا رکھ چھوڑا تھا۔ جس پر وہ صبح شام تفریحی سواری کرتا تھا۔ وہ بولا:۔ کہ سواریوں میں سواری گھوڑے کی سواری۔ باقی سب فضول۔ ریل تو دور دراز کے سفر کے لئے موزوں ہے۔ بلکہ موزوں تھی۔ آج کل جنگی ضروریات کے باعث ٹرینوں میں کمی کر دی گئی ہے۔ اس لئے ہر گاڑی میں اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے کہ آدمی پر آدمی چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اور جب مسافر منزل مقصود پر گاڑی سے اترتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے ہاتھا پائی کر کے آیا ہے۔

لاری کی سواری کا بھی یہی حال ہے۔ اس کے خطرات اس قدر

واضح ہیں کہ شاعر لوگ اب محفل جاناں کو لاری سے تشبیہ دینے لگ گئے ہیں۔ مثلاً ؎

موت کا ڈر، دل میں دھڑکن لب پہ آہ
تیری محفل میں ہیں یا لاری میں ہم

اور موٹر سائیکل تو بالکل شیطان کا چرخہ ہے۔ بس جب کسی کو موٹر سائیکل پر سوار دیکھتا ہوں تو دل دھڑکنے لگتا ہے۔ سوار بڑے فخر کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھا یہ شعر گنگناتا ہے۔

موٹر لگی ہوئی ہے مرے سائیکل کے ساتھ
پھٹ پھٹ پھٹا پھٹا کئے جا رہا ہوں میں

لیکن میں دل میں یہ خیال کر رہا ہوں کہ یہ شخص گھر سے خودکشی کا ارادہ کر کے نکلا ہے۔

اور معمولی سائیکل تو ایک لعنت ہے۔ اس کے جی میں آئے تو آپ کو میلوں لئے جائے اور بگڑ بیٹھے تو آپ اس کو کندھے پر اٹھا کر بیمار سائیکلوں کے شفاخانے تک پہنچائیے۔

اور پھر یہ ساری سواریاں خاص سڑک اور معین راستے کی محتاج ہیں۔ گھوڑا ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ موٹر سائیکل یا بائیسکل پر جا رہے ہیں اور آپ کا کوئی دشمن بھی اسی قسم کی سواری پر آپ کا تعاقب کر رہا ہے تو آپ یقیناً خطرے میں ہیں کہیں نہ کہیں وہ آپ کو جا لے گا۔ لیکن اگر آپ گھوڑے سوار ہیں اور آپ کا دشمن

کسی پہیہ دار سواری پر آپ کا پیچھا کر رہا ہے تو آپ گھوڑے کی باگ موڑ دیئے۔ اور سڑک چھوڑ کر کھیتوں کی طرف ہو جائیے کیا مجال کہ دشمن کی موٹر یا موٹر سائیکل یا بائیسکل آپ کی گرد کو چھو سکے۔

اور پھر گھڑ سوار کے وقار کو تو دیکھئے۔ گھوڑے پر سوار آدمی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شہزادہ۔ مختصر یہ کہ گھوڑا ایک بادشاہی سواری ہے بادشاہی۔

سید علی کی یہ باتیں سن کر میرے دل میں بڑا اشتیاق پیدا ہو گیا کہ میں بھی گھوڑے کی سواری سیکھوں۔ میں پچھلی جنگ کے سلسلے میں ایک فوجی موٹر کمپنی کا بابو تھا۔ میں نے موٹر کمپنی میں رہ کر موٹر ڈرائیوری نہ سیکھی اور جس طرح ملاح کا حقہ کبھی تازہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ یہی خیال کرتا رہتا ہے کہ دریا میں تو ہوں ہی۔ جب چاہوں گا حقے کا پانی بدل لوں گا۔ اس طرح میں بھی خیال کرتا رہا کہ جب چاہوں گا موٹر ڈرائیوری سیکھ لوں گا۔ حتیٰ کہ میں ایک رسالے میں تبدیل ہو گیا۔ یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ گھوڑے میسر تھے۔ لیکن میں وہاں بھی ملازم ہی بنا رہا اور گھوڑے کی سواری نہ سیکھ سکا۔ سید علی کی باتیں سننے کے بعد میں اپنے آپ کو مطعون کرنے لگا کہ موٹر ڈرائیوری نہیں تو نہ سہی۔ گھوڑے کی سواری تو سیکھ لی ہوتی۔

جب میں نے اپنی اس محرومی کا ذکر سید علی سے کیا تو اس نے کہا کہ موٹر ڈرائیوری سیکھ کے کیا کرتے؟ یہی فائدہ ہوتا نا — کہ اگر خدا کبھی آپ کو موٹر کار دے دیتا تو ڈرائیور نہ رکھنا پڑتا۔ لیکن میں تو پہلے

عرض کر چکا ہوں کہ یہ سب چیزیں گھوڑے کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ موٹر کار شاندار اور تیز رفتار سواری ہی سہی لیکن اگر سڑک پر کہیں اجاڑ بیابان میں موٹر بگڑ جائے یا پٹرول ختم ہو جائے تو لاوارثوں کی طرح سڑک پر ہی ڈیرے ڈالنے پڑیں گے تا آنکہ کہیں سے مدد پہنچ جائے۔ گھوڑے کو دیکھو نہ اس کا کوئی پرزہ خراب ہو نہ تیل ختم ہو اور پنکچر ہو جانے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

ان باتوں سے میرا اشتیاق اور بھی بڑھا اور میں نے دل میں عہد کر لیا کہ گھوڑے کی سواری ضرور سیکھوں گا اور وہ بھی سید علی کے گھوڑے پر سید علی کے سائیس سے اور سید علی سے پوشیدہ طور پر مجھے معلوم تھا کہ سید علی ایک ہفتے کے لئے اپنے سسرال جا رہا ہے میں نے اپنا پروگرام بنا لیا۔

جس دن سید علی روانہ ہو گیا اسی دن میں اس کے سائیس کے پاس گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے چار پانچ دن میں گھوڑے کی سواری سکھا دو۔ تمہیں پانچ روپے دوں گا لیکن سید علی کو اس بات کا پتہ نہ چلے۔ سائیس مان گیا۔

میں نے سید علی سے اس بات کو چھپانے کا فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ سید علی کی واپسی پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آؤ نہ آ گیا ہے بڑا گھڑ سوار کیا ہم گھوڑے پر چڑھنا جانتے نہیں ؟ ہم نے یونہی کسر نفسی کی تھی کہ ہمیں گھوڑے پر چڑھنا نہیں آتا۔ آؤ۔ اگر ہمت ہے تو مقابلہ

کر لو۔

پانچ روپیہ کا نام سن کر سائیس کی باچھیں کھل گئیں اور اس نے کہا کہ کل تیسرے پہر اصطبل میں تشریف لائیے۔ وہاں آپ کو سواری سکھائی جائے گی۔ میں نے کہا کہ تعلیم کے دوران میں اصطبل کا دروازہ بند رہنا چاہیئے تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ اس شخص کو ابھی تک گھوڑے پر چڑھنا نہیں آتا۔

رات چارپائی پر لیٹے لیٹے میں شیخ چلی کی طرح ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگا۔ سواری سیکھ چکنے کے بعد ایک گھوڑا خریدوں گا اور اس پر سوار ہوکر کوچہ و بازار میں پھروں گا تاکہ لوگ میری شہسواری کے قائل ہو جائیں۔ میلے پر جاؤں گا تو گھوڑے پر سوار ہوکر تاکہ گرد و نواح کے دیہات کے لوگ بھی دیکھ لیں کہ میں گھوڑے کا سوار ہوں۔ پھر سسرال جاؤں گا تو گھوڑے پر سوار ہوکر۔ بار بار اپنے سالے سے پوچھوں گا کہ بھئی گھوڑے کو دانہ ڈالا؟ گھاس کو ذرا صاف کر لینا۔ میرا گھوڑا بہت نفاست پسند ہے اور دیکھو زین کہیں دھوپ میں نہ پڑی رہے۔ اس کا پالش خراب ہو جائے گا۔ وغیرہ۔

خیال کر رہا تھا کہ خیالات کا یہ سلسلہ ٹوٹے۔ تو سو جاؤں لیکن نیند کہاں؟ جس طرح عید کی انتظار میں نیند نہیں آتی اسی طرح اصطبل کے انتظار میں میری نیند بھی حرام ہو گئی۔ بہر حال آدھی رات کے بعد جاکر کہیں آنکھ لگی اور میں عجیب عجیب خواب دیکھنے لگا۔ الف لیلہ میں پڑھا

تھا کہ ایک شہزادہ آوارہ گردی کی حالت میں ایک شہر کے قریب پہنچا۔ شہر کے باہر اسے گھوڑوں، بیلوں، گدھوں اور دیگر مویشیوں کا ایک بھاری گلّہ ملا جو اس کو شہر میں داخل ہونے سے روکنے لگا کیونکہ یہ جادو کا شہر تھا۔ اور وہاں جو اجنبی جاتا تھا شہر کی شہزادی اس سے ایک آدھ دن رنگ رلیاں منا کر اسے جادو کے زور سے حیوان بنا دیتی اور شہر سے باہر نکال دیتی تھی۔ یہ سب حیوان اسی طرح عالم وجود میں آئے ہوئے تھے۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں گھر سے نکل کر اصطبل کی طرف چلا ہوں۔ راستے میں مجھے بیس تیس گھوڑے ملے جو مجھے اصطبل کی طرف بڑھنے سے روکنے لگے۔ میں ان کے خوف سے پیچھے کی طرف بھاگا۔ گھوڑوں نے میرا تعاقب کیا تاکہ مجھے گھر تک پہنچا کے چھوڑیں دروازے پر پہنچ کر میرا پاؤں چوکھٹ میں اٹکا۔ اور میں دھڑام سے گر گیا۔ گرنے کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ اس کے بعد ہزار کوشش کی لیکن نیند نہ آئی حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔

دن گزرنا محال ہو گیا۔ تصور میں اصطبل سائیس اور گھوڑا گھوم رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے وقت مقررہ آپہنچا اور میں گھر سے نکلا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ سامنے سے سائیس گھبرایا ہوا آ رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ سائیس نے کہا کہ حضور گھوڑا آج عجیب عجیب حرکتیں کر رہا ہے۔ میں آپ کے لئے اس پر زین ڈالنے لگا تھا کہ وہ مجھے کاٹنے

کو دوڑا۔ ہزار کوشش کی لیکن اس نے مجھے پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ گھوڑا بہت سیانا حیوان ہے وہ شائد سمجھ گیا ہے کہ مالک کی غیر حاضری میں زین کسنے کی کوشش کیوں ہو رہی ہے۔ یہ بہت خطرناک معاملہ ہے۔ اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ آپ سواری سیکھنے کا ارادہ ترک کر دیجئے۔

میرا اشتیاق حد سے بڑھا ہوا تھا اس لئے میں نے سائیس سے کہا کہ خدا کے لیئے کوئی چارہ کرو سائیس بولا کہ میں کیا چارہ کر سکتا ہوں؟ گھوڑا مانتا ہی نہیں۔ میں نے کہا کسی نہ کسی طرح مناؤ۔ یہ لو اپنے پانچ روپے اور یہ لو آٹھ آنے کی مٹھائی لا کر گھوڑے کو کھلاؤ سائیس نے کہا۔ مٹھائی؟ واہ حضور! آپ بھی کتنے بھولے ہیں۔ اجی گھوڑے کبھی مٹھائی بھی کھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اور کیا کھاتے ہیں؟ سائیس نے جواب دیا کہ کیلے، سنگترے، سیب، انگور، ناشپاتی وغیرہ میں نے پانچ روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر دیا اور کہا کہ جاؤ اس کو پھل کھلا کر راضی کرو۔ سائیس نے نوٹ تھام کر کہا کہ اب یہ معاملہ کل پر رکھیئے۔

رات بھر قیامت کی رات آئی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر گھوڑا پھل کھا کر بھی نہ مانا تو کیا ہوگا؟ سواری سیکھے بغیر گزارہ نہیں بلکہ زندگی نہیں گھوڑے کو دفعتہً کیا ہو گیا؟ کیا وہ سمجھ گیا ہے کہ میں سواری کے معاملے میں اس کے مالک کو چیلنج کرنے والا ہوں؟

دوسرے دن سہ پہر کے بعد اصطبل میں پہنچا۔ سائیس گھوڑے

پر زین ڈال چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا کہ حضور پھل کھا کر گھوڑا خوش ہو گیا ہے۔ اب بے تکلف چلے آئیے۔ وہ کان تک نہیں ہلائے گا۔ میں قریب گیا اور سائیس بولا کہ اسی رکاب میں پاؤں رکھ کر سوار ہو جائیے میں نے کہا یہ نہیں ہو سکے گا۔ کوئی سیڑھی لاؤ۔ سائیس نے بہتیرا سمجھایا چڑھنے کی ترکیب بتائی لیکن میں نے سیڑھی پر اصرار کیا۔ چنانچہ سائیس سیڑھی لے آیا اور سیڑھی گھوڑے کے ساتھ لگا دی۔ میں سیڑھی پر چڑھنے لگا میرا بایاں پاؤں سیڑھی کے سب سے اوپر والے ڈنڈے پر تھا اور دائیں ٹانگ گھوڑے پر کہ گھوڑا چل پڑا۔ میں ایک لمحے تک ہوا میں معلق رہ کر سیڑھی سمیت زمین پر دھڑام سے گرا اور میری ٹانگ کو ایسی ضرب آئی کہ سائیس نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کر گھر پہنچایا۔ میں ایک مہینہ تک بستر پر پڑا رہا اور اس عرصے میں سید علی میری خبر لینے آیا۔ پوچھنے لگا کہ چوٹ کیسے آئی۔ میں نے جواب دیا کہ سیڑھی سے گر گیا تھا۔

اس دن سے لے کر آج تک میرے دل میں کبھی خیال نہیں ہوا کہ گھوڑے کی سواری سیکھوں۔

پرواز

پروفیسر رمزی گھبرا کر نیند سے بیدار ہوا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے سر کے بال خشخاشی تھے اور داڑھی مونچھیں صفا چٹ۔ اس حلیے میں وہ ایک بڑا سا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ اس دفعہ پھر وہی خواب جو اسے گزشتہ چالیس سال کے دوران میں بار بار ستا چکا ہے اور ہر دفعہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ اُڑ سکتا ہے۔ جس طرح آپ میز پر دونوں ہتھیلیاں رکھ کر اور ان پر دباؤ ڈال کر اپنا جسم زمین سے اٹھا سکتے ہیں اسی طرح پروفیسر رمزی نے ان خوابوں میں معلوم کیا کہ وہ اپنی ہتھیلیوں کو ٹھوس ہوا پر ٹیک کر اور ان پر دباؤ ڈال کر اپنے جسم کو زمین سے دور اٹھا سکتا ہے۔ ابتدا ہر دفعہ وہی ہوتی تھی۔ اس نے

اپنے ہاتھوں سے ہوا پر دباؤ ڈالا اور اس کا جسم زمین سے اُوپر اُٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ جو چاہتا کر سکتا تھا۔ یعنی ہاتھوں سے چپوؤں کا کام لے کر آگے کی طرف پیچھے کی طرف، اوپر کی طرف، نیچے کی طرف۔ غرض ہر طرف جا سکتا تھا۔ وہ کمر کو پچھلی طرف جھکا کر ہوا کے گدیلے پر لیٹ سکتا تھا اور اگلی طرف جھک کر اسی طرح دراز ہو سکتا تھا کہ اس کی پلیٹھ چھت کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔

اس میں کوئی معجزے کی بات نہ تھی۔ یہ دنیا میں بالکل ایک طبعی چیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر رمزی کو یقین ہو جاتا تھا کہ یہ صحیح چیز ہے اور اس دفعہ تو اُس نے اڑنا سیکھ لیا ہے۔ لیکن اس خیال کے آنے کے ایک لمحہ بعد اس پر مایوسی چھا جاتی۔ اس لئے نہیں کہ اُس نے اڑنے کی کوشش کی ہوا اور اس میں ناکام رہا ہو کوشش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایک ہی لمحے میں اس پر روشن ہو جاتا کہ وہ نہیں اڑ سکتا۔

پروفیسر رمزی ایک اعلیٰ کالج کی پروفیسری سے ریٹائر ہو چکا تھا اور اب اسے صرف دو ہی کام تھے۔ اپنے باغیچے کی دیکھ بھال اور اپنی پرائیویٹ لائبریری میں فلسفۂ تاریخ، سرگذشت اور فن تعمیرات کی کتابوں کا مطالعہ۔ وہ باغیچے میں اپنے ہاتھوں سے کام کرتا تھا۔ پودوں کی کاٹ چھانٹ کرنے، قلمیں لگانے اور نلائی کرنے کا اسے بہت شوق تھا۔

آج اسے باغیچے میں بہت سا کام کرنا تھا۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے کے بعد جب وہ سیڑھی کندھے پر رکھ کر آم کے درخت کے پاس گیا تاکہ شاخوں سے آم توڑے اس نے سیڑھی درخت کے تنے کے ساتھ جمادی تو ایک دفعہ پھر اسے اپنے خوابوں کا خیال آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ زندگی بھی کیا کٹھن چیز ہے۔ مثال کے طور پر آم توڑنے ہی کو لیجئے۔ قبل اس کے کہ آم توڑنے کا کام کیا جائے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ سیڑھی کو اٹھا کے لانا اور اس کو ٹھیک جگہ لگانے کے لئے اس کے ساتھ کشتی کرنا اور کام ختم ہو جانے پر پھر اسے اٹھائے ہوئے واپس اس کی جگہ پر پہنچانا اور آم توڑنے کے کام کا تو ذکر ہی نہ کیجئے۔ بندر کی طرح کبھی اوپر چڑھنا اور کبھی نیچے آنا۔ یہ سب کچھ کیا ہی لغویت ہے۔ لیکن اگر انسان میں اڑنے کی طاقت ہوتی تو کیا ہی بات تھی۔

پانچ بجے وہ اس قدر تھک گیا کہ اس نے کام ادھورا چھوڑ دیا۔ سیڑھی کو اس کے مقام پر پہنچا کر غسل کیا اور لائبریری میں مطالعہ کے لئے چلا گیا۔ رات کو اس کے ہاں چند دوستوں کی دعوت تھی۔ جن میں اس کا ایک کج بحث دوست ڈاکٹر اختر بھی مدعو تھا۔ پچھلی دعوت ڈاکٹر اختر کے ہاں ہوئی تھی جس میں ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کے متعلق بحث ہوئی اور ادھوری رہ گئی۔ آج اس کے پھر جاری ہونے کا امکان تھا۔ اس لئے پروفیسر رمزی تاریخی جوابوں سے مسلح رہنے

کی فکر میں تھا۔ اس کے لئے اسے مسٹر ہاری علیگ کی کتاب "کمپنی کی حکومت" کی ضرورت تھی وہ تلاش کرنے لگا۔ لیکن یکایک اسے خیال آیا کہ یہ کتاب سب سے اوپر والی الماری میں ہے جہاں سیڑھی کے بغیر پہنچا نہیں جا سکتا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ ایک کونے میں سیڑھی تھی۔ پروفیسر نے بڑھ کر سیڑھی کو اٹھا لیا اور جونہی اس نے سیڑھی کے پہلے ڈنڈے پر پاؤں رکھا اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت تھکا ہوا ہے اور ایک ہی دن میں شاید پچاسویں بار سیڑھی پر چڑھنے لگا ہے۔ وہ بہت جھلایا اور دونوں ہاتھوں کو ہوا میں مار کر سیڑھی پر لعنت بھیجنے لگا۔ لیکن جونہی اس کے ہاتھوں کا زور ہوا پر پڑا وہ زمین سے از خود اونچا ہو کر ہوا میں تیرنے لگا۔

ہائیں ؟ یہ کیا ؟ ایک ہی لمحے میں وہ الماری تک پہنچ گیا اور اس کا سر چھت کے ساتھ چھونے لگا۔ اس نے کتاب نکالی اور دوسرے لمحے میں اس کے پاؤں زمین سے آ لگے۔ حیرت سے اس کا دماغ چکرا گیا۔ یہ کیا ہوا ؟ وہ زور زور سے سانس لینے لگا اور گرتا پڑتا آرام کرسی تک پہنچ کر اس پر دراز ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا میں پاگل تو نہیں ہو گیا ؟ یا کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ؟ ہرگز نہیں گوشت پوست کا بنا ہوا رمزی اپنے ہوش و حواس کی قائمی اور عالم بیداری میں اڑنے کے قابل ہو گیا۔ کیا میں پھر اڑنے کی کوشش کروں نہیں نہیں۔ ابھی نہیں۔

اس نے کتاب کھولی اور اُڑنے کی بات کو بھول کر مطالعہ میں لگ گیا۔ لیکن شام کے وقت جب وہ اپنے کمرے میں گیا تو اسے اپنی پرواز کا پھر خیال آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر آج تک میں کیوں اس نعمت سے محروم رہا؟ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ میں نے کبھی اُڑنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی ورنہ پہلی کوشش میں ہی کامیاب ہو جاتا لیکن مجھے اپنی بیوی کے سامنے یہ راز کھولنے میں ذرا احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

رات کے وقت کھانے کی میز پر پروفیسر رمزی نے ڈاکٹر اختر سے کہا کہ اگر میں اپنی کرسی سے اڑ کر کمرے کے پرلے سرے پر چلا جاؤں تو پھر؟

ڈاکٹر اختر بولا کہ لغو باتیں نہ کرو۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ پروفیسر بولا کہ اگر میں کر کے دکھا دوں؟

ڈاکٹر نے کہا کہ اگر بفرضِ ناممکن تم ایسا کر بھی لو تو میں سمجھوں گا کہ ہر انسان ایسا کر سکتا ہے اور میں بھی کر سکتا ہوں۔ البتہ میں تمہاری پرواز کے وقت اتنی احتیاط ضرور کروں گا کہ تم اڑتے وقت مرغ کی پلیٹ ساتھ نہ اٹھا لے جاؤ۔

پروفیسر نے کہا کہ اگر میں اُڑ کے دکھا دوں۔ تم نہ اڑ سکو؟

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ پھر میں یہ سمجھوں گا کہ تم نے اپنے جسم پر کہیں کسی قسم کی گیس کی تھیلیاں چھپا رکھی ہیں۔ یا چھت سے کوئی ایسا تار

باندھ رکھا ہے جسے میں نہیں دیکھ سکتا۔ پروفیسر نے ایک قہقہہ لگایا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

صبح کے وقت جب پروفیسر رمزی اور اس کی بیوی چائے پینے لگے تو پروفیسر سے رہا نہ گیا اور اُس نے بیوی سے کہا کہ میں نے ایک نیا انکشاف کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں ہوا میں اُڑ سکتا ہوں۔ مسز رمزی نے نگاہ حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ پروفیسر بولا۔ یہی کہ میں اڑ سکتا ہوں مسز رمزی نے اپنا ہاتھ خاوند کی پیشانی پر رکھا اور کہا کہ تمہارا جسم تو گرم نہیں۔ لیکن ذرا ٹھہرو۔ یہ کہکر وہ اٹھی اور تھرما میٹر لے آئی۔ پروفیسر بولا یہ کیا؟ بیوی نے کہا تھرما میٹر ہے اور کیا ہے۔ قمیص کے بٹن کھولو۔ پروفیسر حیرت سے اس کی طرف تک رہا تھا۔ بیوی نے خود اس کے بٹن کھول کر تھرما میٹر اس کی بغل میں دے دیا۔ اور مناسب وقت گزرنے پر نکال کر دیکھا اور کہا بخار تو بالکل نہیں پھر آپ بہکی بہکی باتیں کیوں کرنے لگے۔

پروفیسر بولا۔ اگر یقین نہیں تو دیکھو۔ ان الفاظ کے ساتھ وہ کرسی سے اٹھا اور بیوی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کا خاوند زمین سے ایک فٹ اوپر ہوا میں معلق کھڑا ہے۔ بیوی بولی۔ بس یہی کچھ؟ پروفیسر نے کہا۔ مزید یہ کہ میں جتنی بلندی پر چاہوں جا سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ذرا اوپر اڑا۔ حتیٰ کہ اس کا سر چھت سے ایک انچ

نیچے تک پہنچ گیا۔ لیکن اسے ایک ہی لمحے میں زمین پر اترنا پڑا۔ کیونکہ اس کی بیوی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی تھی۔

اس کے بعد چند روز تک اس موضوع پر دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی البتہ بیوی پر خوف و ہراس طاری رہنے لگا۔ ایک دوپہر کے بعد اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کہ پروفیسر کا سر آم کی شاخوں میں نظر آرہا ہے۔ شاخیں ہل رہی ہیں اور وہ آم توڑ رہا ہے۔ بیوی بھاگ کر کوٹھی سے باہر نکلی اور درخت کے قریب جا کر اس نے دیکھا کہ پروفیسر سیڑھی کے بغیر ہوا میں معلق آم توڑ رہا ہے۔ وہ ڈر کر کوٹھی کی طرف بھاگ گئی اور جب پروفیسر آیا تو بیوی نے کہا کہ میرے ساتھ ایک وعدہ کیجئے۔ پروفیسر نے پوچھا کہ کیا وعدہ؟ بیوی بولی کہ جب آپ آم توڑنے جائیں تو سیڑھی استعمال کیا کریں پروفیسر نے وعدہ کر لیا اور پرواز کرنا چھوڑ دیا۔

کچھ عرصے کے بعد پروفیسر بازار میں کار پر سوار جا رہا تھا کہ ایک جگہ اس نے خلقت کا بے پناہ ہجوم دیکھا۔ ایک چہار منزلہ مکان جل رہا تھا اور فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے کی ناکام سی کوشش کر رہے تھے پروفیسر نے کار ایک طرف کھڑی کر دی اور ہجوم میں گھس گیا۔ وہاں اس کا دوست ڈاکٹر اختر بھی کھڑا تھا۔

اتنے میں جلتے ہوئے مکان کی چوتھی منزل پر سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ ہجوم کی آنکھیں اس طرف متوجہ ہوئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک عورت کھڑکی سے باہر جھکی ہوئی مدد کے لئے پکار رہی ہے اور

کھڑکی سے آہستہ آہستہ دھواں نکلنا شروع ہو گیا تھا اور یہ بے چاری نیچے اتر نہیں سکتی۔

کھڑکی کے نیچے والی منزل سے شعلے باہر ہو رہے تھے اس لئے فائر بریگیڈ کی سیڑھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پروفیسر نے یہ کیفیت دیکھی تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے جھٹ اپنا کوٹ اور ٹوپی اتار کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں دے دی اور ایک ہی جست میں پرواز کر کے کھڑکی تک جا پہنچا۔ یہ دیکھ کر تمام ہجوم پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ پروفیسر عورت کو اپنے کندھوں پر بٹھائے اور دونوں ہاتھوں سے اسے تھامے ایک ہی لمحے میں زمین پر آ رہا۔ چند منٹ کے بعد وہ اخباری نمائندوں کے گھیرے میں تھا۔

دوسرے دن اخبارات میں جلی سرخیوں کے ساتھ اس کے پرواز کی خبر چھپی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے مکان پر چٹھیوں کا ایک سیلاب آنے لگا۔ ڈاکٹر، پروفیسر، ماہرینِ روحانیات، ریسرچ سکالر، سائنسدان، سرکس والے، سینما والے، غرض ہر قسم کے لوگ خطوں کے ذریعے ملاقات کی اجازت طلب کرنے لگے اور پروفیسر کا سارا سارا دن چٹھیاں کھولنے اور پڑھنے میں گزرنے لگا۔

ایک دن جبکہ وہ چٹھیاں پڑھ پڑھ کر حد سے زیادہ تھک چکا تھا۔ اور پلنگ پر دراز ہونے کو تھا کہ اس کا دوست ڈاکٹر اختر آ دھمکا۔ پرواز کی باتیں ہونے لگیں تو ڈاکٹر نے کہا کہ میں اس پر یقین نہیں رکھتا۔

پروفیسر گرج کر بولا کہ تم تو موقع پر موجود تھے ۔ پھر یقین نہ کرنے کے کیا معنی ؟ ڈاکٹر نے کہا کہ بلاشبہ میں وہاں موجود تھا اور میں نے تمہیں اُڑتے دیکھا لیکن میں نے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں کیا ۔ میں اب بھی اس پر یقین نہیں رکھتا ۔

تانگے والا

مجھے دفتر آتے جاتے وقت ریلوے کا بالائی پل عبور کرنا پڑتا ہے۔ یہ پل گرانڈ ٹرنک روڈ (متصل فیض باغ) سے شروع ہو کر ریلوے لائنوں کے اوپر سے ہوتا ہوا اسٹیشن کے باہر ختم ہوتا ہے اور اس مقام کے سامنے تانگوں کا اڈا ہے۔ اس سے مجھے صبح و شام تانگہ والوں کی باتیں سننے اور اُن کی حرکات دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے اور ان کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ خدا کی دلچسپ مخلوق ہے۔

پچھلی جنگ کے سلسلہ میں ایک دفعہ مجھے ایم۔ ٹی۔ کمپنی (فوجی ٹرانسپورٹ کی کمپنی) میں ملازمت کرنے کا موقع ملا۔ ہماری کمپنی کے ایک حوالدار میجر عبداللہ خاں بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ بارہ بیڑے (یعنی مختلف فوجی سروس میں مثلاً رسالہ، پیادہ فوج، توپ خانہ وغیرہ)

تو گورنمنٹ نے بنائے تھے۔ لیکن موٹر کمپنی تیرھواں پڑا ہے جسے شیطان نے بنایا ہے۔ میں نے پوچھا "وہ کیوں"؟ حوالدار میجر بولے "اس لئے کہ موٹر ڈرائیور بھی خاندان کوچبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تانگہ چلاتے ہیں اور وہ موٹر لیکن ہیں دونوں بان۔ اس لئے "شیطان" میں وہی روائتی جواب دے کر خاموش ہو رہا کہ ہاں مہربان"!

میں اس حد تک تو نہیں جاتا کہ کوچبان کو شیطان یا شیطان کی مخلوق کہوں البتہ یہ کہتے میں مجھے باک نہیں کہ کوچبان "شیطان کی ٹولی" ضرور ہوتے ہیں۔ سواریوں سے اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کر جاتے ہیں کہ ہنسی آجاتی ہے۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ سٹیشن پر ایک مسافر نے ایک تانگے والے سے پوچھا کہ "سبزی منڈی چلو گے"؟ یہ کسی اور طرف جا رہا تھا۔ اس لئے اس نے ایک دوسرے تانگے والے کو آواز دی اور کہا "اے فجو۔ انہیں سبزی منڈی لے جاؤ۔ چار آنے مل جائیں گے"۔ فجو نے جواب دیا "بات تو ٹھیک ہے لیکن سبزی منڈی ہے"؟ گویا اس نے بھلے چنگے انسان کو سبزی کا ڈھیرا بنا دیا۔

ایک دفعہ "موٹے دروازے" کے سائز کا ایک بھیرکم آدمی دادا بھائی کی دکان کے پاس کھڑا تانگے کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک تانگہ قریب آیا۔ کوچبان نے پوچھا۔

بابو جی کہاں جاؤ گے"؟

بابو جی! "موچی دروازے"۔

کوچبان:۔ آیئے "میں لے چلتا ہوں"۔

بابوجی:" کتنے پیسے"؟

کوچبان:" آٹھ آنے"

بابوجی:" وہ کیوں یہاں سے موچی دروازے کے لئے چار آنے ہوتے ہیں"

کوچبان:" ٹھیک کہا آپ نے ایک پھیرے کے چار آنے ہوتے ہیں لیکن مجھے آپ کو دو پھیروں میں لے جانا پڑے گا"

ایک یو۔پی کا باشندہ سڑک کے کنارے تفریحاً کھڑا تھا کہ ایک تانگہ والا قریب آیا اور پوچھنے لگا کہ " میر صاحب کہاں جایئے گا"؟

میر صاحب بولے:" کہیں نہیں" تھوڑی دیر کے بعد۔ ایک اور تانگہ قریب آیا۔ اور کوچبان نے پوچھا" کہاں تک میر صاحب"؟ میر صاحب زبان سے تو کچھ نہ بولے لیکن نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد تیسرے تانگے والے نے میر صاحب سے یہی سوال کیا اب کے ذرا سخت لہجہ میں میر صاحب بولے کہ" کہیں نہیں جاؤں گا بھائی۔ کیوں تنگ کرتے ہو"؟ لیکن میر صاحب کھڑے ایسی جگہ پر تھے۔ جہاں تانگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اس لئے ایک اور تانگے والا آپ کے سر پہ گیا اور بولا:" کہاں جایئے گا جناب"؟ میر صاحب اس دفعہ بہت ترش ہو گئے اور جھنجھلا کے بولے" جاؤں گا جہنم"

کوچبان نے نہایت نرمی سے کہا:" آیئے، تشریف لایئے لیکن

اتنا بتا دیجئے کہ صرف جانا ہی جانا ہوگا یا واپس بھی آئیے گا" ؟

مزا اس وقت آتا ہے جب تانگے والوں میں سواریوں حاصل کرنے کے لئے کشمکش ہوتی ہے ۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ اسٹیشن کے قریب ایک مرد، ایک عورت اور ایک بچہ کھڑے تھے ۔ مرد نے ایک گٹھری اٹھائی ہوئی تھی اور عورت نے چھوٹا سا بچہ انگلی سے لگا رکھا تھا ۔ تانگوں والے شور مچاتے ہوئے ان کی طرف بڑھے ۔ ایک نے مرد کے ہاتھ سے گٹھری چھین لی اور یہ کہتا ہوا اپنے تانگے کی طرف بھاگا کہ آؤ میاں جی بس جا ہی رہا ہوں ۔ دوسرے نے بچے کو اٹھایا اور اپنے تانگے میں بٹھا دیا ۔ تیسرا کوچبان مرد کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے تانگے کی طرف کھینچنے لگا اور چوتھا عورت سے التجائیں کرنے لگا کہ بی بی جی ذرا میرا گھوڑا تو دیکھو ۔ اتنے میں ادھر سے ٹریفک کا سپاہی سیٹی بجاتا ہوا ان کی طرف بھاگا ۔ چونکہ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے سواریاں لادنے کی اجازت نہ تھی ۔ اس لئے دو تانگے سپاہی کی شکل دیکھتے ہی بھاگ گئے ایک میں بچہ تھا ۔ اور دوسرے میں گٹھری ادھر بچے کے ماں باپ دہائی دے رہے تھے اور ادھر تانگے بھاگے جا رہے تھے ۔ آخر کانسٹبل نے ان کا تعاقب کرکے انہیں پکڑا اور مسافروں کا "مال" ان کے حوالے کیا ۔

بعض دفعہ تانگہ والوں کی گت بھی بن جاتی ہے ۔ ایک دفعہ ایک کوچبان یہ کہتا ہوا تانگہ لئے جا رہا تھا کہ "دو ہاری لے چلیا جے" یعنی

لوہاری لئے جا رہا ہوں۔ سامنے ایک عورت جا رہی تھی۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گھوڑے کی باگیں پکڑ کر تانگہ روک لیا اور لگی گالیاں دینے "اپنی ماں کو لے جاؤ" "اپنی بہن کو لے جاؤ" "تیرے دادے داڑھی"۔ "تیرے سنی پیڑی" وغیرہ۔ لوگ جمع ہو گئے۔ اور کوچبان کو بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ کوچبان مار کھا رہا تھا اور چلا رہا تھا کہ "آخر میرا قصور کیا ہے ذرا دم تو لو ؟" آخر ایک دانا آدمی نے کہا کہ "بھائی ذرا اس کی بات تو سن لو" جب مارنے والے رک گئے۔ تو اس شخص نے پوچھا کہ "بی بی بات کیا ہے" ؟ بی بی نے کہا کہ "موا کم بخت راہ چلتی عورتوں سے چھیڑ خانی کرتا ہے"۔ پوچھا گیا کہ اس نے تم سے کیا چھیڑ خانی کی ہے ؟

عورت بولی "یہ کہہ رہا تھا کہ "لوہاری لئے جا رہا ہوں۔ آخر مجھے لے جانے والا یہ کون ؟ اس کے گھر ماں نہیں ؟ بہن نہیں میں لوہاری ہوں تو کیا آوارہ عورت ہوں ؟" (عورت ذات کی لوہاری تھی)

تانگے والوں کو چونکہ ہر قسم کی سواریوں سے واسطہ پڑتا ہے اس لئے وہ معلومات کا خزانہ ہوتے ہیں اور خاص طور پر بد معاشی کے اڈوں اور بد معاش مرد عورتوں کو تو ان سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ ایک دفعہ ایک کوچبان نے مجھے ایسا واقعہ سنایا جو افسانے سے کم دلچسپ نہیں۔

"بلا" میں ایک صاحب کو ہر روز ان کے دفتر پہنچایا کرتا تھا۔ اور شام کو واپس لایا کرتا تھا۔ وہ مجھے ماہوار تنخواہ دیتے تھے۔ کچھ

عرصہ ان کے گھر آنے جانے کے بعد ان کی نوجوان اور خوبصورت بیوی نے مجھے اپنے "دفتر" کے لئے لگایا۔ بی بی کا دفتر ایک ہوٹل تھا۔ انہوں نے مجھ سے راز داری کی قسم لے کر ایک روپیہ روزانہ دینے کا اقرار کیا اور معاملہ چلتا رہا۔ ایک روز میں بابو صاحب کو دفتر پہنچانے کے بعد بی بی جی کو ہوٹل لے گیا اور باہر ٹھہرا رہا بی جی کا معمول تھا کہ وہ ہوٹل کے اندر جاکر چند منٹ کے بعد مجھے اطلاع کر دیتی تھیں کہ میں ایک آدھ گھنٹہ تک ٹھہرا رہوں یا دوبارہ آؤں۔ بی بی جی نے دیر لگا دی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ہوٹل کے اندر سے بی بی جی اور ان کا خاوند دست و گریباں ہوتے ہوئے باہر آرہے ہیں۔ میں حیران تھا کہ میں تو بابو جی کو دفتر میں چھوڑ کر آیا تھا یہ کہاں آ گئے۔

دونوں لڑتے جھگڑتے سڑک پر آ گئے اور کئی لوگ جمع ہو گئے دونوں میں جو گفتگو ہوئی وہ یہ ہے۔

خاوند: "فحبہ کہیں کی۔ ہوٹلوں میں بدمعاشی کراتی ہے؟ یہاں کیا لینے آئی تھی"۔

بیوی: "اور تم یہاں کیا لینے آئے تھے"؟

خاوند: "مجھے تمہارے متعلق شک پیدا ہو گیا تھا کہ تم اس ہوٹل میں بری نیت سے آتی ہو۔ اس لئے میں امتحان کرنے آیا"۔

بیوی: "مجھے بھی شبہ تھا کہ تم اس ہوٹل میں بدمعاشی کرنے آتے

ہو اس لئے میں بھی امتحان کے لئے آئی۔"

اتنے میں ایک شریف آدمی نے یہ کہہ کر بیچ بچاؤ کرا دیا کہ چھوڑو اس قصے کو تم دونوں ایک دوسرے کا امتحان کرنے آئے ہو اور شکر ہے کہ دونوں پاس ہو گئے ہو اب صلح کرلو اور جاؤ گھر کو۔

دونوں نے صلح کر لی اور میرے تانگے کی طرف بڑھے پہلے تو میرا ارادہ یہ ہوا تھا کہ بھاگ جاؤں۔ پھر میں نے سوچا کہ میرا اس میں کیا قصور ہے؟ اور پیسے کیوں چھوڑوں؟ چنانچہ میں کھڑا رہا۔ دونوں تانگے کے پاس آئے اور بابو جی مجھ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے اور ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ میں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا البتہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس پر عورت بولی۔ اس کے پیسے کون دے گا؟ خاوند بولا "تم!" بیوی نے پُرزور لہجہ میں کہا "نہیں تم" اس پر ایک شخص نے کہا "اپنے اپنے پیسے دے دو۔ ایشور کی کرپا سے دونوں کماؤ ہو۔"

میرا خیال تھا کہ میری تنخواہ گئی۔ لیکن بابو جی بڑے شریف آدمی تھے۔ جب میں نے دونوں کو ان کے گھر کے باہر اتارا تو بابو جی بولے "دیکھو میاں آج سے تم میرے ہاں نہ آیا کرو۔ اور تنخواہ کے دن دفتر آکر اپنی تنخواہ لے جانا" میں اب بابو صاحب کو ان کے دفتر نہیں پہنچایا

کرتا البتہ بی بی جی کا بادستور ملازم ہوں ۔ جنہوں نے اپنا دفتر بدل لیا ہے ۔

۱

جرمنی کے ایک اخبار میں اعداد و شمار شائع کئے گئے ہیں جن سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک جرمن لڑکی نے میدان جنگ میں جانے والے سپاہیوں کو ایک لاکھ چھپن ہزار بوسے دیئے اور وہ اس کارنامے پر بڑا فخر کر رہی ہے ------ اخبار مذکور نے بھی اس کو نہایت فخر کے ساتھ شائع کر کے جرمنی کی دوسری لڑکیوں کو ترغیب دی ہے کہ وہ بھی اس قومی خدمت میں فیاضی کا ثبوت دیں۔

خیال ہے کہ اس لڑکی نے بوسوں کے حساب کتاب کیلئے ایک اکاونٹنٹ بھی رکھ چھوڑا ہوگا لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اکاونٹنٹ کو تنخواہ ملتی ہے یا بوسے۔

۲

اخبار مذکور کی اپیل رائیگاں نہیں گئی۔ ایک دوسری جرمن لڑکی میدان مقابلہ میں اُتر آئی ہے اور اس نے نہایت قلیل عرصے میں ایک لاکھ دس ہزار بوسے جنگی فنڈ میں دے دیئے ہیں۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ میں ڈیڑھ لاکھ بوسے دے کر پہلی لڑکی کا ریکارڈ توڑ دوں گی اور نیا ریکارڈ قائم کروں گی۔

بیشک یہ ریکارڈ قائم ہو جائے گا اور اس کامیابی کے ساتھ کہ لڑکی کا ہر گال گھسا ہوا پرانا ریکارڈ بن جائے گا۔

۳

جاپان بھی "قومی خدمت" میں جرمنی سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ہے۔ جرمنی کی لڑکیاں تو جنگی فنڈ میں بوسوں کی تھیلیاں دے رہی ہیں لیکن جاپانی طوائفیں مال و زر کی تھیلیاں بھی دے رہی ہیں۔ ان کے مکانوں پر اس قسم کے بورڈ آویزاں ہیں:۔

ہم سے لطف حاصل کرو اور اس طرح اپنے بھائیوں کی مدد جو وطن کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہماری آمدنی بڑھاؤ۔ ہماری مدد قوم اور ملک کی مدد ہے۔

سُنا ہے کہ اُن طوائفوں نے حکومت کو ایک ہوائی جہاز پیش کیا ہے "بالائی" آمدنی کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں ہوسکتا ہوائی رزق اور ہوائی جہاز۔

۴

بمبئی کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ وہاں کے ایک سیٹھ کی دوستی شتلابہ کی ایک لڑکی سے ہوگئی۔ سیٹھ نے لڑکی کو سینما کی دعوت دی اور اسے لے کر سینما گئے ساتھ ہی اپنے چند ہمراہیوں سے کہہ دیا کہ لڑکی کے مکان پر جاکر چوری کرو۔ چنانچہ انہوں نے چوری کرلی۔ لڑکی نے واپس آکر گھر کا یہ حال دیکھا تو پولیس میں رپورٹ کردی کہ میرا ایک ہزار چار سو روپیہ چوری ہوگیا۔ پولیس نے سیٹھ کو گرفتار کرکے عدالت میں پیش کردیا۔

معلوم نہیں کہ سیٹھ جی نے کیا بیان دیا ہوگا یا کیا بیان دیں گے۔ بہرحال یہ بیان بہتر ہوگا کہ لڑکی نے میرا دل چرایا اور میں نے اس کا مال۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ نیز یہ کہ اہل شہر کی طرف سے بلا امتیاز مذہب و ملت کرانے کے لئے خدا کی درگاہ میں دعا کی جائے گی۔

لاہور میں صرف ایک ہی درگاہ ہے یعنی سنّی محب بیٹ کی بارگاہ

لیکن اہل لاہور کی دعا پیادوں کے ڈر سے کچہری تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔

ایک فوجی افسر نے آسام کے جنگلوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہاں ہر چیز بانس کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ بانس کا دروازہ، بانس کا احاطہ، بانس کی جھونپڑیاں، بانس کی کرسیاں، بانس کی میزیں، بانس کے پلنگ، بانس کی نرم چھال کے گدے تکیے، بانس کے برتن، ان پر بانس کے ٹکڑوں کے ڈھکنے غرضیکہ ہر چیز بانس۔ اخبار "پیام" دکن نے اس خبر کی سرخی لگائی ہے "جہاں بانس ہے وہاں آس ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر "پیام" نے کبھی پتنگ بازی نہیں کی اور کبھی اپنے ہاتھ سے پتنگیں نہیں بنائیں ورنہ وہ یہ عنوان دیتے "جہاں بانس ہے وہاں پھانس ہے۔"

۶

اخبار "نیوز کرانیکل" لکھتا ہے کہ اگر ہٹلر مر جائے یا گونگا ہو

جائے یا پاگل ہو جائے تو بھی موجودہ جنگ جاری رہے گی کیونکہ نازی لیڈر جانتے ہیں کہ جرمنی کی شکست کی صورت میں ان کا انجام کیا ہوگا ؟

میں اس بد دعا کے حق میں نہیں کہ ہٹلر مر جائے، اسے اپنے نازی لیڈروں کا انجام بھی دیکھنے کے لئے ضرور زندہ رہنا چاہیئے گونگا ہو جائے تو مضائقہ نہیں ۔

ے

شیخ سعدی نے گلستاں میں قاضی ہمدان کی ایک حکایت لکھی ہے جس میں مذکور ہے کہ بادشاہ وقت نے قاضی صاحب کو ایک گناہ کبیرہ کرتے کرتے عین موقع پر پکڑ لیا اور حکم دیا کہ قاضی کو قلعے کی فصیل پر سے نیچے گرا دیا جائے۔ قاضی نے عرض کیا کہ حضور سزا سے مقصود تو عبرت ہے اگر میں مر گیا تو آپ کے سزا دینے سے مجھے کیا عبرت ہوئی ؟ کسی اور گنہگار کو فصیل پر سے گروا دیجئے تاکہ اس کی موت دیکھ کر مجھے عبرت حاصل ہو اور میں آئندہ گناہوں سے باز آؤں۔

راقم الحروف بھی اسی لئے چاہتا ہے کہ ہٹلر زندہ رہے اور وہ نازی لیڈروں کا انجام دیکھے اور اس کا انجام اس کی روح ۔